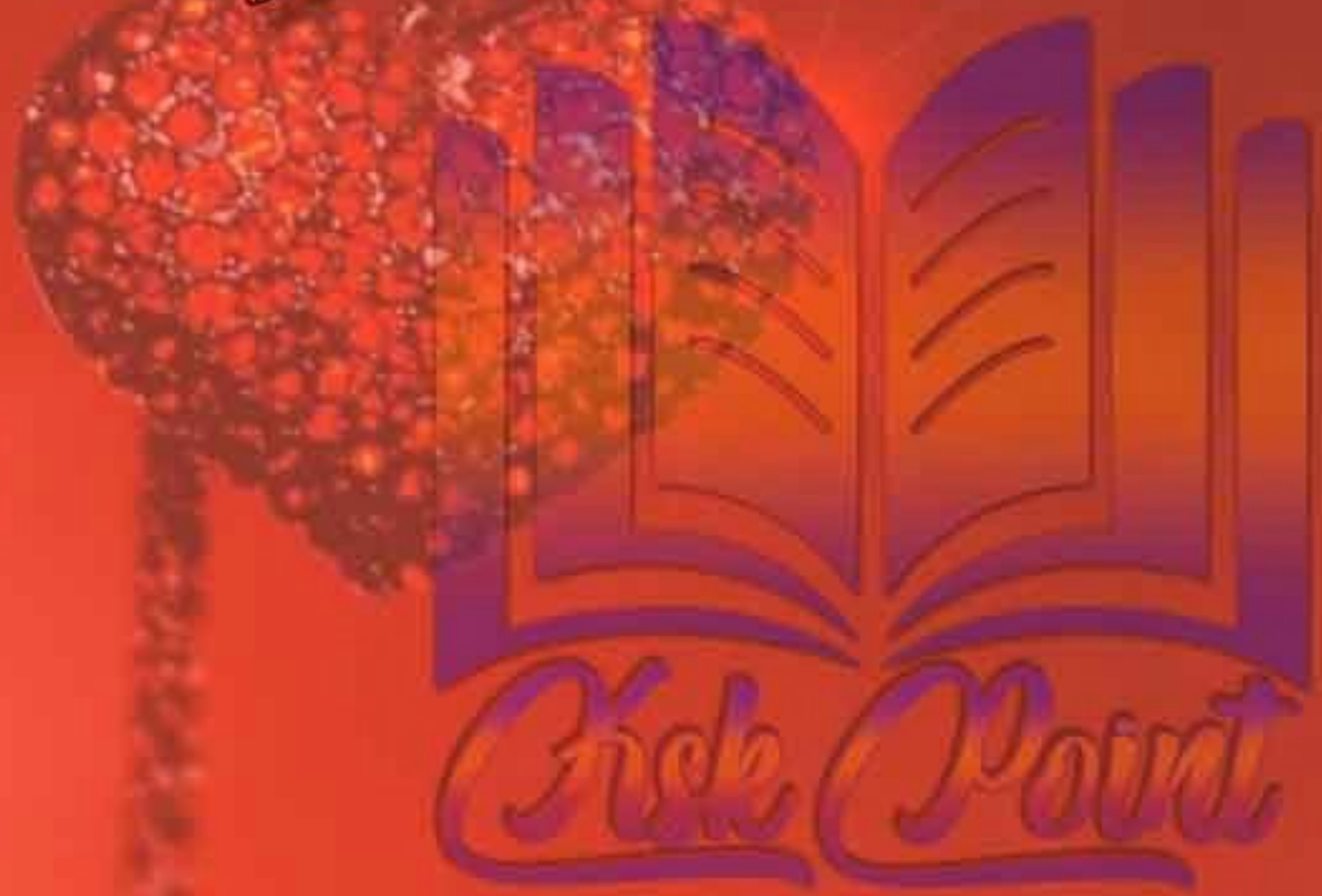


سحر ساجد

# عنان گیر



پاکیزہ ڈائجسٹ اکتوبر 2017





# عنّان گیرا

محرّاج



آنکھیں بن جائے وہ ہی کان اس کے سوا کچھ سنائی نہ دے  
اور اس کے علاوہ کوئی بات نہ بن پڑے..... ایسا کیسے ہو سکتا  
ہے بھلا؟ ہاں کہنے کو، سوچنے کو عجب بات ضرور لگتی ہے..... مگر  
یہ عجب ہے نہیں..... وہ یوں کہ میں اس کیفیت کو، اس حالت  
کو سالوں سے بھگت رہی ہوں کہ اس کے سوا سب... عجب

کبھی، کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وجود، وجود  
نہیں رہا، دل، دل نہیں رہا..... کوئی کیفیت، کوئی حالت اس  
قدر کیسے بڑھ سکتی ہے کہ بڑھتے، بڑھتے وہ آپ کے پورے  
وجود پر حاوی ہو جائے۔ دل کو ڈھانپ کر رکھ دے۔ عقل کو  
باندھ دے۔ بس پھر..... وہ ہی کیفیت، وہ ہی حالت آپ کی



گناہ..... بدنامی سادھتا ہے۔ خواہش..... کہنے کو پانچ حرفی  
 الفاظ ہیں: یہ پانچ حروف یکجا ہو کر جسم پر دھاوا بولتے ہیں  
 اور دل مارنے کر لیتے ہیں تو پھر یہ محض پانچ حروف تو نہیں رہ  
 جاتے ناں..... یہ ایک ”فاح“ کی سی حیثیت اختیار کر لیتے  
 ہیں اور یہ فاح آپ کا عمان گیر بن جاتا ہے..... خواہشیں  
 بے لگام ہوتی ہیں مگر یہ انسان کے اتنے بڑے وجود کو لگام  
 ڈالنا جانتی ہیں، اسے کھینچ کر اپنی مرضی، اپنی منشا اور اپنے  
 راستے پر چلانا جانتی ہیں..... ضرورت پڑے تو کوڑا بھی مارتی  
 ہیں، زخم بھی لگاتی ہیں اور تڑپ کی چوٹ سے بھی کام نکال  
 لیتی ہیں، سچ بڑی ہی بے رحم شے ہے یہ خواہش..... کہ بچوں  
 کے بل کھڑا کیے رکھتی ہے..... سر کے بل چلانا جانتی ہے۔  
 انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی، سراپا دشت بنا ڈالتی ہے۔  
 ایسا دشت، وہ صحرا جو مینہ کے نام پر صرف طلب کا پورا ہونا  
 مانگے۔ کبھی، کبھی مجھے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ میری  
 ”خواہش“ نے مجھے کتا بنا چھوڑا ہے۔ یہ خواہش جیسے میرا  
 ذاتی دوزخ ہے۔ خود کا بھڑکا یا ہوا جہنم..... جس میں اپنی  
 مرضی سے، اپنے اختیار سے جل رہی ہوں اور جلنا تو پڑتا ہی  
 ہے ناں..... ہر کسی کو، ہر ایک کو اپنے، اپنے جہنم میں..... یہ تو  
 سہنا ہی پڑتا ہے۔ کہ کیا جائے اس کے سوا اور چارہ بھی کیا؟  
 میری خواہش، میری تمنا کوئی خواہشات یا تمناؤں کا مجموعہ تو  
 نہیں..... محض ایک، فقط ایک خواہش..... اور میں چاہتی  
 ہوں کہ مجھے اس خواہش کو پورا کرنے کی اجازت دے دی  
 جائے۔ ہاں..... مجھے اجازت درکار ہے۔ مجھے اس جہنم میں  
 بھسم ہونا منظور ہے..... راکھ بن کر بکھرتا منظور ہے اور اگر  
 راکھ نہ بھی بنوں، بھسم نہ بھی ہوں تو اور اگر ساری عمر.....  
 ساری عمر یوں ہی جلتے رہنے کا عذاب بھی مجھ پر مسلط رہے تو  
 یہ بھی منظور..... لیکن اجازت کے بنا مجھے خواہش کا پورا ہونا  
 نہیں منظور..... اور خواہش..... خواہش بھی کیا؟ ایسی کہ جو  
 گناہ کہلائے۔

”تو مجھے ایک گناہ کرنے کی تمنا ہے، صرف ایک  
 گناہ.....“ باقاعدہ سر پہ مہر اجازت نامہ..... کہ فلاں بنت  
 فلاں جاؤ تمہیں تمہاری خواہش پوری کرنے کی اجازت دی  
 جاتی ہے..... اس طرح سے کہ مجھے محسوس نہ ہو کہ میں نے  
 کوئی گناہ کیا ہے..... مجھے یہ ہی محسوس ہو کہ میں نے صرف

اپنی خواہش کی تکمیل کی ہے اور اس طرح سے کہ مجھ سے  
 پوچھا نہ جائے..... اس طلب، اس خواہش کا کوئی حساب نہ لیا  
 جائے..... سوال کیا جائے نہ ہی جواب مانگا جائے۔ طلب کا  
 کیا ہے وہ تو انسان کو ”خدا“ بننے پر بھی مجبور کر دیتی ہے اور  
 میں، میں تھک گئی ہوں، ٹوٹ چکی ہوں اس طلب، اس  
 خواہش کو دباتے، دباتے۔ خود کو سمجھاتے کہ یہ گناہ کرنے کی  
 خواہش بھی دراصل گناہ ہی ہے۔ لیکن یہ خواہش..... یہ  
 طلب کسی طرح سے تھمتی نہیں، دبتی نہیں۔ یہ مجھے مجبور کرتی  
 ہے، اکساتی ہے، کوڑے مارتی ہے اور زخم لگاتی ہے اور میرا  
 دل گھٹنوں کے بل گرتا ہے..... شرم سے سر جھکتا ہے..... لب  
 جرات نہیں کرتے مگر یہ آنکھیں، یہ دل، یہ خود بخود لب بن  
 جاتے ہیں، میری مرضی کے بغیر ہی..... یہ شاید اختیار سے  
 باہر کی چیز ہے..... ہاں یہ اختیار سے باہر کی چیز ہے.....  
 جب بھی آنکھیں نیلے آسمان کی طرف اٹھتی ہیں تو ایک ہی  
 فریاد سوال بن کر ان میں اٹھ اٹھ آتی ہے دل ہمک، ہمک کر  
 پوچھنے لگتا ہے۔

”کیا مجھے اجازت ہے؟ اجازت ہے مجھے؟“  
 لیکن..... لیکن کوئی جواب نہیں آتا..... کوئی اشارہ نہیں  
 ملتا۔ کوئی الہام بھی نہیں اترتا..... اور ادھر..... خموشی، ایک  
 ازلی..... ابدی خموشی..... اور میرا دوزخ، میرا ذاتی جہنم یہ کچھ اور  
 بھڑک اٹھتا ہے۔ یہ بھڑ بھڑ جلنے لگتا ہے اور پھر بھی مجھے راکھ نہیں  
 کرتا..... بس جلاتا ہے اور جلائے ہی چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

اگر آپ دور سے اسے دیکھیں تو وہ ایک لمبا، سیاہ دھبا  
 نظر آتی تھی اور جیسے، جیسے وہ دھبا واضح ہوتا جاتا تھا تو سمجھ  
 میں آ پڑتا تھا کہ اچھا..... یہ تو کوئی لڑکی ہے۔ سیاہ عبایا، سیاہ  
 نقاب، ہاتھوں پہ سیاہ ہی دستا نے اور سیاہ جوتوں میں سیاہ ہی  
 جرابوں میں مقید پیر اس کے پورے وجود میں ایک آنکھیں  
 ہی تھیں جو نظر آتی تھیں اور وہ بھی اس طرح سے نظر آتی  
 تھیں کہ دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ وہ اکثر فوکل گلاسز لگائے  
 رکھتی تھی سو اس کی پہچان یہ عبایا ہی تھا۔ لوگ اس کو اس کے  
 نام سے کم اور اس کے لباس سے زیادہ جانتے تھے۔ سو لوگ  
 بھی کھڑے ہوں تو وہ ان میں سے بھی پہچانی جاسکتی تھی۔ اس  
 نے خود کو چھپائے رکھا تھا مگر نظر میں سب کی تھی..... اور اس



## عنان گیر

رکھتی ہے خود کو..... نمبر دو اس نے خود پر مغروریت کا خول چڑھا رکھا ہے تاکہ کوئی اس کے پاس نہ آئے اور حال ہی میں ایک تیسرا مفروضہ بھی زبان زد عام ہوا ہے کہ وہ کسی ایسے ویسے (سمجھ تو آپ گئے ہوں گے) علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ سب کو یہی لگتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں پھیلے مفروضات سے بے خبر ہے اور جتنی بے خبر ہے اسی لیے بے ضرر بھی ہے..... تو یہ جس کا تعارف ہے، وہ..... وہ ”غزل مراد“ ہے۔

☆☆☆

”اوائے مانی.....! اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی غزل مراد کا پتا ہے؟“  
”نہیں پتا۔“

”ہا..... ہائے نہیں پتا؟“ جواباً زارا خالص لاہوری انداز میں میں ہا، ہائے کہتے ہوئے دہری ہوئی تھی۔ ”بھلا اس جامعہ میں کوئی ایسا بھی ہے کہ جسے غزل مراد کا نہیں پتا.....“ مانی نے اس کی حیرت کا نیون سائن بنی شکل کو دیکھا اور پھر پورے گروپ کو..... سب کم و بیش ایسے ہی انداز میں اسے دیکھ رہے تھے کہ جامانی، تجھے غزل مراد کا نہیں پتا..... تو بس کچھ نہیں پتا،..... درنہ منہ تیرے پر مانی بیچارہ بھی کیا کرتا..... ایک تو وہ ہجرت کر کے میرا مطلب ہے کسی اور کالج سے ماسٹریٹ ہو کر آیا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ انگریزی کا طالب علم تھا..... اب انگریزی والے بھول چوک کر بھی اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی طرف رخ نہیں کرتے کہ خواہ مخواہ میں فتوے نازل اور پھر صادر ہونے لگتے ہیں تو ایسے میں اگر مانی کو ”غزل مراد“ کا نہیں پتا تو بس نہیں پتا..... یہ اتنا بڑا حادثہ تو نہیں تھا کہ جس پر یوں ہا ہائے کہا جاتا..... مانی کو خواہ مخواہ میں ہی بے عزتی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ویسی ہی بے عزتی جیسی کہ اس وقت محسوس ہوتی ہے کہ جب یہ پوچھ لیا جائے کہ علامہ اقبال کی تاریخ وفات کیا ہے اور آپ جواب میں محض ہکلا کر رہ جائیں تو بس مانی کو بھی ویسی ہی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

”چل آ..... تجھے غزل مراد دکھاتے ہیں۔“ یاور نے اس کے کندھے پر ہاتھ اور زارا کو آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔  
”بڑی ہی متبرک شے ہے۔ اک درشن سے ہی

لیے تھی کہ لوگ اسے عجیب سمجھتے تھے۔

کوئی دوست نہ سہیلی..... بدروح کی طرح اکیلی ہی گھومتی نظر آتی تھی۔ کبھی جامعہ کی لائبریری میں تو کبھی کسی لان کے ویران کونے میں..... کبھی کسی خالی کلاس روم میں اور کبھی کسی استاد کے پاس..... اس کے ہاتھ میں ہر وقت کتابیں پائی جاتی تھیں۔ موٹی، موٹی نظر میں یک دم آجانے والی، سمجھ میں نہ آنے والی۔ اس کے ہم جماعت بتاتے تھے وہ جماعت میں بھی یوں موجود ہوتی ہے گویا کہ نہیں ہے اور یہ وہم یقین پکڑنے لگتا ہے کہ وہ نہیں ہے تو وہ یوں سامنے آجاتی ہے کہ بس وہ ہی تو ہے..... اس کی موجودگی بڑی بھاری ہوتی ہے۔ ہر طرف چھائی ہوئی۔ بولتی ہے تو لب سی لینے کو جی چاہتا ہے۔ سوال کرتی ہے تو خود جواب بن کر پیش ہونے کو من کرتا ہے۔ لڑکے تو لڑکے اکثر لڑکیاں بھی اس کی پراسراریت کا شکار دکھائی دیتی ہیں۔ ذہین ہے اتنی کہ اس کی ذہانت اساتذہ کو بھی بوکھلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سوال زیادہ نہیں کرتی..... بس جو کبھی کبھار کر دیتی وہ ہی کئی دن کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جماعت میں سب سے پہلے موجود ہوتی ہے ایسے کہ ہر دوسرے آنے والے طالب علم کو لگتا ہے کہ وہ اس کے بعد آیا ہے اور بے اختیار اسے کوسنے کو دل کرتا ہے۔ کبھی تو یہ لیٹ ہو جایا کرے کبھی تو..... اس کی حاضری پر اسے کوسا جاتا ہے اور غیر حاضری میں حیرت سے مڑ، مڑ کر اس کی سیٹ کی جانب ٹکا جاتا ہے کہ ہائیں وہ نہیں آئی؟ کیا واقعی وہ نہیں آئی..... وہ معما ہے..... سمجھ میں آئے تو حل ہوتا..... کہاں سے آتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کس کوچے، کس گلی سے تعلق ہے..... معلوم ہوگا تو صرف جامعہ کی انتظامیہ کو ہی ہوگا..... باقی سب کے لیے ہے تو وہ یوں وارد ہوتی جیسے ابھی، ابھی اسے کوئی خلائی گاڑی نیچے اتار گئی ہو۔ خاموش اتنی کہ بولتی ہوئی لگتی اور جب بولتی تو خموشی ہر طرف پھیل سی جاتی..... اب کیا یہ بھی بتاؤں کہ امتحان میں بھی اول آتی ہے اور کبھی موج میں ہو تو تقریری مقابلے میں بھی حصہ لے لیتی ہے اور جب لیتی ہے تو مجال ہے کسی اور کو آگے نکلنے کا موقع دے۔ اس کے بارے میں دو مفروضات عام ہیں، نمبر ایک، وہ بے حد بد صورت ہے اسی لیے تو یوں چھپا کر



سارے اٹنے کام سیدھے ہو جائیں گے۔“ یہ حسن تھا۔  
 ”کیا بکواس ہے..... میں اسلامیات ڈیپارٹمنٹ  
 میں اب لڑکی دیکھنے جاؤں گا؟“ وہ بھٹائی تو گیا تھا۔  
 ”ہا..... ہائے۔“ زارا نے ایک بار پھر اسی انداز میں  
 کہا۔ ”وہ لڑکی نہیں پاجی..... مطلب ”غزل مراد“  
 ہے۔“ زارا اطلاع دینے والے انداز میں بولی تھی۔  
 ”ہیں.....“ مانی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا کہ وہ  
 کہہ کیا رہی تھی۔

”صحیح کہہ رہی ہوں مانی۔“ اور پھر ان تینوں نے مل کر  
 اس کے تجسس کو کچھ اس طرح سے پنکھا جھلا کہ وہ اسلام آبادی  
 ہونے کے سارے مینرز گٹر میں پھینک کر اسے دیکھنے چل دیا  
 تھا کہ جو لڑکی نہیں..... ”غزل مراد“ تھی۔

☆☆☆

”اس کلاس روم کے آگے سے ناک کی سیدھ میں  
 یوں گزرتے جاؤ جیسے تم اپنے کسی کام کے لیے جا رہے  
 ہو۔ غزل مراد کو دیکھنے نہیں..... وہ اسی کلاس روم میں بیٹھی  
 فضلہ کو پی رہی ہے۔“ یا اور اسے پٹی پڑھا رہا تھا۔  
 ”تم مرداؤ گے مجھے.....“ وہ ذرا سا متاثر تھا۔

”یہ فائل پکڑو اور اسے کھول کر پڑھتے ہوئے  
 سیدھے گزر جاؤ..... بس پڑھتے، پڑھتے بائیں آنکھ ذرا سی  
 ٹیڑھی کر کے دیکھ لیتا..... سامنے ہی تو ہے۔“ حسن نے اسے  
 اپنی فائل پکڑاتے ہوئے کہا..... کل ملا کر کوئی دو منٹ اور  
 پچیس سیکنڈ پہلے حسن نے بھی یونہی دیدار کی طلب کو ٹھنڈا کیا  
 تھا۔ مانی نے ان تینوں کی شکلیں دیکھیں..... اور وہ سب  
 شکلیں اس سے کہتی تھیں۔ ”جا بیٹا جا..... امرت ہے گھول کر  
 نہ سہی ذرا سا چکھ ہی آ.....“

اور مانی نے فائل پکڑی..... سر کو فائل کے تقریباً، تقریباً  
 اندر ہی گھسایا۔ وہ اس جماعت کے دروازے کے سامنے  
 سے گزرا..... بائیں آنکھ کو ذرا سا ٹیڑھا کیا اور یہ کیا ہوا.....  
 دھڑام..... فائل اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری اور وہ حیرت  
 کے پُر اثر جھٹکے کے زیر اثر..... منہ کھول کر اسے دیکھنے پر خود کو  
 روک نہیں سکا تھا۔ غزل نے کچھ گرنے کی آواز سنی.....  
 لاشعوری طور پر سر اٹھایا اور پتا نہیں اب کے کتنوں فرد منہ کھول  
 کر اسے یوں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس

بھری، سکون سے اٹھی، چیزیں اٹھائیں اور اس معلوم نہیں  
 کتنے دیں فرد کے پاس سے سر جھکا کر گزر گئی تھی۔ اور اس کے  
 دور جاتے ہی ان تینوں کا قہقہہ ابلا اور چوتھے پہ جا گرا.....

”یہ..... یہ غزل مراد تھی؟“ وہ ابھی تک حیرت زدہ  
 تھا..... وہ اس لڑکی نما چیز کو دیکھنے آیا تھا..... خاص طور  
 پر..... انگریزی ڈیپارٹمنٹ سے اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی  
 مسافت طے کر کے، اس کا نام تو برقع مراد ہونا چاہیے  
 تھا..... وہ بھٹا کر پلٹا تھا..... ”لعنت ہے مجھ پہ.....“ سرخ  
 چہرہ لیے وہ بڑبڑایا۔

”لا لے تو کیا سمجھا تھا کہ تو لیٹ آیا ہے سوریلنگ سے  
 بچ جائے گا..... نہ بیٹا ناں.....“ یا اور مزہ لیتے ہوئے بولا  
 تھا..... اور وہ مانی..... شرٹ کے دونوں بازو اوپر چڑھاتے  
 ہوئے سرخ منہ لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”بندہ کسی کو تو چھوڑ دیتا ہے اور تم لوگوں نے عبایا والی  
 کو بھی نہیں بخشا..... کچھ نہیں تو اس کے عبایا کا ہی لحاظ  
 کر لیتے.....“ وہ کھولتے ہوئے، بولتے ہوئے ان کی جانب  
 بڑھ رہا تھا اور وہ تینوں ہنستے ہوئے اک ساتھ قدم، قدم  
 پیچھے کو ہٹتے جا رہے تھے۔

اور وہ نہیں جانتا تھا کہ کارڈر کے آخری سرے پر  
 اس جملے پر کسی کے قدم یک دم ساکت ہو کر ٹھہرے گئے  
 تھے۔ اور دو آنکھوں نے بے حد حیرانی سے اس کی پشت کو  
 دیکھا تھا۔

”تو اس بھری جامعہ میں واقعی ہی میں کوئی ایک انسان  
 بھی تھا؟“

☆☆☆

مانی نے سمجھا تھا کہ وہ کوئی بے حد خوب صورت لڑکی  
 ہوگی..... کوئی ماورائے عقل حسن کہ جس کے لیے اسے یوں  
 مجبور کیا جا رہا تھا۔ اب مانی کوئی زاہد خشک تو تھا نہیں جو منکر  
 ہوتا..... لیکن آگے سے جب ایک لپٹی لپٹائی لڑکی دیکھنے کو  
 ملی تو..... تو..... ایک تو بکی اور اوپر سے اسے غصہ بھی آیا کہ  
 کسی کو تو بخش دیں..... جو نظر نہیں آتا چاہتی کم از کم اس کو  
 تو..... مانی کے حلقہ احباب میں جتنے لڑکے شامل تھے اس  
 تناسب سے ایک، دو فیصد زیادہ لڑکیاں موجود تھیں۔ کچھ  
 اسکول فیلوز، کالج فیلوز، یونی فیلوز، کزنز وغیرہ،



## عنان گیر

ہوتی ناں..... تو جو اس ٹائپ کی نہیں ہوتی..... اس کے لیے ذہانت کڑاوار تھی۔ بھلا بتاؤ اب..... لڑکیاں بیچاریاں بچیں تو کہاں تک بچیں آخر.....

☆☆☆

”کو آرہی ہے وہ.....“ ٹیٹا کے جملے پر سب نے باجماعت ہو کر اس جانب لگا تھا کہ جس جانب تکتے ہوئے تک چڑھی ٹیٹا نے اپنی ناک اور چڑھائی تھی۔ وہ کوئی ساہ سا لمبا سا دھبا نظر آتا تھا۔ ٹیٹا کو دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ انگلش میڈیم اسکول سے پڑھی ہے۔ برگر طرز کے ماحول میں ہی پرورش پائی ہے اور یہ کہ ممی کو ممی ہی بلاتی ہوگی۔ منہ بس اتنا سا ٹیڑھا کر کے وہ دیکھنے میں دل کش محسوس ہو..... ”T“ اور ”R“ کی آواز ٹیٹا انگلش بولتے ہوئے یوں نکالتی تھی کہ بیچارے انگریز انگلیاں منہ میں دا بنے پر مجبور ہو جائیں۔ (تلفظ) phonetics تو اس پر ختم تھے بس اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا نام ٹیٹا نہیں ناز کی ہونا چاہیے تھا..... تو جب ’ناز کی‘ میرا مطلب ہے ٹیٹا نے غزل کو دیکھ کر ناک چڑھائی..... تو وہ سب اس طرف ہی دیکھنے لگے۔

”انتہا پسند..... دہشت گرد لوگ..... معلوم نہیں انہیں یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہی کیوں دیا جاتا ہے..... اسلام اور پاکستان کے سو فٹ ایج کو انہی جیسے لوگوں نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔“ نخوت اور تنفرد دونوں ہی جھلکتے تھے ٹیٹا لہجے سے۔

”کم آن ٹیٹا..... کیا ہو گیا ہے، تمہیں کیا کہتی ہے؟“ مانی حیران ہوا۔

”تم نہیں جانتے مانی..... ان لڑکیوں کو چھپ کر بھی نظر آنے کا فن آتا ہے تم دیکھتے نہیں کہ کیسے پوری یونی ”غزل مراد“ کو جانتی ہے۔“ اس کا تنفر اور بڑھاتا تھا..... مانی نے سر جھٹکایوں جیسے اس کی بات سے اتفاق نہ ہو۔

”اب ذرا دیکھنا تم لوگ.....“ ٹیٹا کو تو معلوم نہیں کیا سوچتی تھی کہ یک دم وہ اس طرف گئی تھی جس طرف سے غزل آرہی تھی..... اس نے اتنی آنا فانا اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ کوئی روک بھی نہیں سکا تھا۔

”ہائے.....“ اس نے یک دم غزل کا رستہ روکا اور بل چباتے..... انگلی پر پاؤچ کی چین کو جھلاتے ہوئے ایکسرے کرتی نظروں سے غزل کو دیکھ کر کہا۔ غزل نے

وغیرہ..... سب کے ساتھ اس کا تعلق ایسا ہی تھا جیسا کسی دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کچھ، کچھ اخلاقیات کا بھی قائل ہی تھا۔ لیکن چونکہ انگریزی ادب کا طالب علم تھا جو تو جنس کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ قدرے سحرے دماغ کا آدمی تھا۔ کوئی لڑکی کچھ پوچھنے آتی تو بس وہ بتانے پر ہی اکتفا کرتا تھا۔ کوئی ہیلو ہائے کرتی تو جواباً اس کا جواب بھی ہیلو ہائے تک ہی رہتا۔ زارا اور ٹیٹا کی بات دوسری تھی البتہ۔ زارا گروپ فیلو تھی اور وہ اسلام آباد دیا..... اس کی پنجابی نما انگریزی پر فدا تھا۔ رہ گئی ٹیٹا، تو ٹیٹا تو اسکول کے زمانے کی دوست تھی۔ جینز کے پانچے چڑھا کر جمعہ بھی پڑھتا تھا اور ایک ہی سموسوں کی پلیٹ ٹیٹا اور زارا یا پھر کسی بھی دوسری، تیسری دوست لڑکی کے ساتھ شیئر بھی کر لیتا تھا۔ لڑکیوں سے ہاتھ ملانے کو بھی برا نہیں سمجھتا تھا۔ اور ٹیٹا سے Twilight کے رومانس اور اس رومانس کی شدت پر سیر حاصل بحث بھی کر لیتا تھا۔ سو بحیثیت مجموعی مانی اپنے دوستوں کی نسبت اچھا بندہ تھا..... باقیوں کو اگر آپ دس میں سے ایک بھی نمبر نہیں دیتے تو مانی کو آپ 5 یا 6 تو دے ہی سکتے تھے۔ مانی کو چند دن لگے تھے اس جامعہ میں پیر جانے اور اپنا سکہ بٹھانے میں..... وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کا ذہانت کے لحاظ سے ”غزل مراد“ ہی تھا..... دو ٹکڑے کے لوگ مگر ٹکڑیوں وقوع پر نہیں ہو سکتی تھی کہ دونوں مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھتے تھے۔ غزل مراد کی وجہ شہرت ذہانت کے ساتھ، ساتھ اس کا خاص حلیہ اور اینارمل روپہ بھی تھا جبکہ مانی..... مجھے کہنے دیں کہ لڑکیاں اس پر مری تھیں..... نہ، نہ ذہانت پہ نہیں..... صرف اور صرف اس پر..... وہ کہانی کا ہیرو تھا تو اب اتنا تو بنتا ہی تھا کہ کم از کم لڑکیاں اس پر فدا تو ہوں..... باقی رہ گئی ذہانت کی بات تو سمجھیں..... یہ جلتی پرتیل تھا بلکہ پٹرول تھا..... چلو جو اس کے ہینڈسم ہونے پر نہ مرے جس کا دل اس کی مسکراہٹ سے پاش، پاش نہ ہو تو کم از کم ذہانت تو اس کا ستیاناس کرے اور ضرور ہی کرے..... اب ہر لڑکی اس ٹائپ کی تو نہیں ہوتی ناں۔ ”ہائے اللہ مانی..... کتنا چارمنگ ہے ناں وہ..... ڈرینک تو اس پر ختم ہے۔ اور بات کرنے کا اسٹائل..... مائے گاڈ.....“ اب ہر لڑکی تو اس ٹائپ کی نہیں



۱۱۔ ماہی مگر کھری نظر اس پر ڈالی اور دوسری نظر ڈالے  
۱۲۔ انا وہاں گئی تھی کہ اس کے باقی دوست بھی ذرا قاصدے  
۱۳۔ انا تھی۔

”رہو.....“ بے حد سکون سے جواب آیا۔ خواہ مخواہ  
ماہی بیچنے کی قائل نہیں تھی وہ۔

”تم اتنا سخت نقاب کیوں کرتی ہو؟“  
”مجھے اچھا لگتا ہے.....“ ذرا سا توقف۔ ”جس طرح

آپ کو دوپٹا نہ اوڑھنا اچھا لگتا ہے.....“ آخری جملے پر ٹیٹا  
ہر طرح سے چونکی اور پھر کھول کر رہ گئی تھی۔

”تم اتنا پسند ہو۔“ ٹیٹا کے لہجے میں پھر سے نفرت  
پھار رہی تھی۔

”میں اتنا پسند ہوں؟“ غزل نے حیرت سے سوال کیا۔  
”میں.....؟“ وہ اب تک بے یقین تھی۔ ”میں نے

آپ کا رستہ روک کر..... آپ کے حلیے، آپ کے لباس پہ  
سوال نہیں اٹھایا..... یہ آپ ہیں..... تو پھر اتنا پسند میں

کیسے؟“ وہ ابھی تک بے یقین اور حیران تھی۔  
”شٹ اپ.....“ ٹیٹا تلملائی اور بھڑک کر بولی تھی۔

”یو شٹ اپ.....!“ جواب سرد، سخت مگر نیچی آواز  
میں آیا تھا۔ اتنا کرخت کہ ٹیٹا آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے پر

مجبور ہوئی تھی۔ اور ٹیٹا کی اس حالت پر زارا تیز، تیز قدموں  
سے چلتی ہوئی ان تک آئی تھی اور اس کے پیچھے وہ تینوں بھی

کہ بات بڑھ رہی تھی۔  
”آئی ایم سوری..... یہ بس ایسے ہی.....“ زارا نے

غزل کو دیکھ کر کہا تھا۔  
”ایک بات تو بتائیں۔“ غزل نے کتابوں کا وزن

ایک بازو سے دوسرے بازو پر منتقل کرتے ہوئے نرم لہجے  
میں زارا سے پوچھا۔

”جی.....“ زارا ہٹا تھی۔  
”انگریزی ڈیپارٹمنٹ میں ایسے ہی ایٹارل لوگ

ہوتے ہیں کیا؟“ بے حد پیار سے مارا گیا اک اور تھپڑ..... مانی  
بے ساختہ رخ موڑ کر مسکرایا..... ٹیٹا پھٹ پڑنے بلکہ اس کا

منہ لوپنے کو تیار جبکہ یا اور احسن نے بھی مسکراہٹ روکی تھی۔  
”جی.....؟“ زارا اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ اس کے جی کہنے

میں ایک سوالیہ حیرت چھپی تھی۔

”تم.....“ ٹیٹا غرائی اور حملے کے واسطے آگے کو  
بڑھی..... زارا نے بروقت اسے کندھوں سے پکڑ کر روکا تھا۔

”اور اب بھی میں ہی اتنا پسند ہوں؟“ غزل نے ٹیٹا  
کی آنکھوں میں براہ راست دیکھ کر کہا اور پھر سر جھٹک کر

وہاں سے چلی گئی تھی۔ اور ٹیٹا..... وہ اب انگریزی میں اسے  
گالیاں دے رہی تھی۔

”تو تم نے یہ دکھانا تھا ہمیں کہ غزل مراد جب بے  
عزتی کرتی ہے تو وہ بے عزتی کیسی ہوتی ہے؟“ یہ مانی تھا۔

”شٹ اپ مانی۔“ ٹیٹا نے اپنا پاؤں زور سے اس کے  
سینے پر دے مارا تھا۔ ان تینوں کا قہقہہ گونجا تھا۔ جبکہ زارا صرف

مسکرائی تھی..... اور ٹیٹا کاش کہ اس کے پاس اس وقت بزوکا  
ہوتی تو وہ سب کو اڑا دیتی..... سمیت اس غزل مراد کے.....

☆☆☆

وہ اسے وہاں موجود دیکھ کر مڑ جانا چاہتا تھا مگر حیرت  
نے اس کے پیر پکڑ ہی لیے تھے۔ ”غزل مراد اور انگلش

ڈیپارٹمنٹ؟“ وہ سر تیمور سے کچھ ڈسکس کرنے آیا تھا مگر  
آگے غزل مراد کچھ بات کرتی نظر آئی تھی۔ وہ مڑ جانا چاہتا تھا

مگر براہوسر کی نظر کا جو عین اسی لمحے اس پر پڑی تھی کہ جب  
وہ مڑنے کا ارادہ باندھ ہی چکا تھا۔

”مانی! آ جاؤ یار!.....“ سر تیمور بے تکلف سے انداز  
میں کہہ کر پھر سے غزل کی طرف متوجہ ہوئے تھے..... وہ اندر

آیا اور حیرت سے اس کی پشت دیکھتے ہوئے صوفے پر جا  
بیٹھا تھا..... اسی دوران اس کے علم میں آیا تھا کہ سر تیمور

اسلامیات والوں کی communication skills  
کی کلاس لیا کرتے تھے..... سو وہ اسی وجہ سے وہاں موجود

تھی۔ مانی اپنا سیل نکال کر اس پر مصروف ہو گیا تھا۔ اس  
بات سے یکسر بے خبر کہ وہ دونوں کیا گفتگو کر رہے تھے۔

”ہاں بھئی مانی.....!“ تھوڑی دیر بعد وہ سر کی آواز پر  
چونکا اور سیل بند کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے ان کی طرف

متوجہ ہوا..... اور جیسے ہی اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا تو وہ  
کھلا کا کھلا ہی رہ گیا بلکہ منہ بد مزہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس غزل

نے پھر سے کچھ پوچھ لیا تھا، سراسر اسے جواب دینے لگے تھے۔  
مانی نے ایک بار پھر اس کی پشت کو ایک عدد تیز قسم کی گھوری

سے نوازا تھا۔



## عنان گیر

اسلامیات سے آپ بنی نوع انسان کے لیے کوئی ایجاد کوئی خدمت تو کرنے سے رہے.....“

”آپ کو لگتا ہے سر کہ میرے جیسا دماغ جب کل کو اسلامیات پڑھائے گا تو وہ ویسے ہی پڑھائے گا جیسے کہ باقی اساتذہ پڑھاتے ہیں؟“ اس پر جیسے سر کے دلائل کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بس ان کے جواب سے سوال نکالے جا رہی تھی۔

”نہیں..... یقیناً بہتر ہوگا مگر سوال وہیں پر.....“

انسانیت کے لیے کیا ہوگا؟“

”انسانیت کے لیے جو ہونا تھا سر وہ چودہ سو سال پہلے

ہو چکا..... اب کرنا بس اتنا ہے کہ اسے انسانیت تک پہنچانا

ہے، کیسے؟ کس طرح؟ اور کس طریقے سے؟ یہ سب ہم پہ

منحصر کرتا ہے..... تو جب آپ بنی نوع انسان کی بات کرتے

ہیں سر، ان کی خدمت کی بات کرتے ہیں تو آپ کے ذہن

میں صرف سائنس ہی کیوں آتی ہے؟ اسلامیات کیوں نہیں؟

کیا مسلمان بنی نوع انسان کا حصہ نہیں.....؟ کیا یہ کارنامہ

نہیں کہ آپ دین کا علم کسی ایک مسلمان تک اس طرح، اس

طریقے سے ڈیلیور کریں کہ وہ معاشرے کا فعال، مثبت اور

ذمے دار حصہ بن کر جامعہ سے نکلے اسلامیات کے لیے

سارے تھکے دماغ ہی رہ گئے ہیں کیا؟ میں یا مجھ جیسے دماغ

کیوں نہیں سر.....؟ آپ نے کبھی سوچا ہے سر کہ کنڈرگارٹن

سے لے کر BA, BSC تک آپ یہ ہی پڑھاتے رہتے

ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا..... سچ بولنا ہے، چوری کرنا بری بات

ہے اور اسی طرح کی بے شمار دوسری باتیں..... کیا آپ نے

عمل کہیں دیکھا.....؟ دیکھا کہیں..... آپ کو نہیں لگتا کہ

ایسا..... علم کو ٹھیک طرح سے ڈیلیور نہ کرنے کی وجہ سے

ہے..... میرا خواب ہے کہ میں اسلامیات میں پی ایچ ڈی

کروں اور اور جب میں اسلامیات پڑھاؤں گی تو تب اگر

ایک بھی I repeat sir ایک بھی طالب علم، باعمل بن

کر میری کلاس سے نکلا تو میں اسے اپنا ایک کارنامہ ہی

سمجھوں گی..... ہم ہر وقت یہ دہراتے رہتے ہیں ناں کہ

نیولین نے کہا تھا۔ ”تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں عظیم

قوم دوں گا.....“ اور میں کہتی ہوں سر آپ مجھے باکمال استاد

دیں میں آپ کو عظیم معاشرہ دوں گی اور تاریخ گواہ ہے کہ

انسانیت کی بنیاد معاشرہ ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ غزل..... کیا گھول کر پیتی ہو.....“

تمہارے اسائنمنٹ میں تو غلطیاں ڈھونڈنے سے بھی نہیں

ملتیں۔“ سر تیوراس کا اسائنمنٹ واپس کرتے ہوئے بولے تھے۔

”پینے پینے کا تو معلوم نہیں سر.....! البتہ اماں خالص

زیتون کے تیل سے سر میں مالش ضرور کرتی ہیں۔“ انداز ہلکا

پھلکا سا تھا..... سر ہنس پڑے..... اور مانی ایک دفعہ پھر سے

ابے گھورنے پر مجبور ہوا۔

”اچھا..... تو یہ ہنس بول بھی لیتی ہے۔“ اس پر جیسے

انکشاف ہوا تھا۔

”اتنی ذہانت کے باوجود آرٹس کیوں غزل؟ سائنسز

کیوں نہیں؟“

”آرٹس کیوں نہیں سر..... اور سائنسز ہی کیوں؟“

سوال کے جواب میں الٹا سوال اور مانی نے التجا کرتی نظروں

سے سر کو دیکھا کہ اس کا ٹائٹم ویسٹ ہو رہا تھا اور وہ تھے کہ ”ہاں

بھئی مانی.....“ کہہ کر پھر سے غزل نامہ شروع کیے بیٹھے

تھے..... غزل کے سوال پر سراک لمحے کوچپ ہوئے۔

”سائنسز کا اسکوپ ہے، ترقی کے چانسز زیادہ ہیں۔

ایک بہتر مستقبل جبکہ اسلامیات..... ایک ذہن دماغ کو

معمولی ٹیکٹکس نہیں پڑھنے چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کو تم کوئی

کارنامہ ہی سر انجام دے دیتیں..... اب اسلامیات میں

بندہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔“

”سائنس پڑھ کر بھی زیادہ سے زیادہ کیا کر لینا تھا سر

میں نے؟“

”کوئی ایسا کارنامہ جو بنی نوع انسان کے کام

آتا..... رہتی دنیا تک.....“

”تو کیا بنی نوع انسان کی خدمت اسلامیات پڑھ کر

نہیں ہو سکتی سر.....؟“ سر نے اچنبھے سے اس کا چہرہ دیکھا

اور مانی نے اس کی پشت.....

”بھلا اسلامیات پڑھ کر بندہ کون سا کارنامہ انجام

دے سکتا ہے..... کون سی انسانیت کی خدمت کی جاسکتی

ہے.....“ مانی نے ایسے ہی جملوں کو سوچا۔

”جواب دیں ناں سر.....!“ وہ مصر تھی۔

”میرا نہیں خیال.....! اسلامیات پڑھ کر آپ زیادہ

سے اسے پڑھا ہی سکتے ہیں اور کر کیا سکتے ہیں..... اب



لوگ لہیک کہتے تھے، جب وہ سوال کرتی ہے تو خود اب بن کر پیش ہونے کو جی چاہتا ہے..... جب وہ بولتی ہے تو خاموشی..... ہا..... اور ایسے ہی تو یہ قول زبان زد عام نہیں تھا کہ غزل مراد کی ذہانت..... اساتذہ کو بھی بوکھلانے پر مجبور کرتی ہے..... سر تیمور اس کے تقریر نما جواب پر لا جواب ہوئے اور پھر مسکرا دیے۔

”میرا پہلا سوال اب بھی محفوظ ہے غزل.....؟ کیا گھول کر پیتی ہو؟“

”زیون کا تیل سرا!“ اس نے شگفتگی سے مگر ترنت جواب دیا تھا۔ اس بات پر سر ہنس دیے جبکہ مانی مسکرائے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے اپنی چیزیں میٹیں اور مڑ کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ رک گئی۔ مانی کے پیر جو حائل ہو گئے تھے وہ ٹانگیں پھیلائے، صوفے پر نیم دراز تھا۔

”سوری!“ مانی نے تیزی سے پاؤں پیچھے کیے تھے غزل سر جھکا کر گزر گئی تھی۔

”کیا چیز ہے یہ سرانم سے مجھے اب محسوس ہونے لگا ہے کہ انگلش کو ماروں لات ساتھ میں دو چار گھونے بھی..... اور اسلامیات میں آنرز پھڑکا دوں.....“ مانی نے بہ مشکل اس کے دروازے سے باہر ہونے کا انتظار کیا تھا اور مانی نہیں جانتا تھا کہ غزل کے ذہن کے ساتھ، ساتھ اس کی حس سماعت بھی بہت تیزی سے کام کرتی تھی..... اس نے سن لیا تھا اور سنتے ہی ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

عبدالحمید کا نام شہر بھر کے لیے نیا نہیں تھا..... پورا شہر ان کو اسی طرح سے جانتا تھا کہ جس طرح سے وہ شہر کے چوکوں سے واقف تھے۔ اپنی ملازمت کے دنوں میں بھی وہ سرکاری افسر سے زیادہ ایک چیمڑی ورکر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کی ایمانداری ان کا حوالہ تھی گو کہ بیوروکریسی میں یہ ناممکن سی بات تھی مگر یہ وہ... ہی ”ممکن“ تھا کہ جس کے لیے لفظ ”ناممکن“ ایجاد ہوا تھا..... ان کی باقاعدہ کوئی تنظیم تو نہیں تھی لیکن کسی بھی سوشل ویلفیئر کے لیے وہ اپنے وسائل اور تعلقات کام میں لاتے تھے۔ ہمیں پہل لگوانا ہو... صاف پانی کا فلٹر یا شہر کے کسی کھلے مین ہول کا

ڈھکن..... وہ ہمیشہ اپنی مدد آپ کا کلیہ لگاتے اور پھر خدائی مدد کا انتظار کرتے تھے اور کبھی مایوس نہیں رہے تھے۔ اب بھی ایک خیال کیڑا بن کر ان کے دماغ میں گھس چکا تھا۔ انہیں اپنے شہر میں بھی دیوار مہربانی بنوانی تھی۔ یہ مثبت تحریک تھی اور انہیں بے حد پسند آئی تھی۔ چلو پاکستانی یوتھ نے بھی اپنی پوٹینشل کو کسی مثبت کام میں لگایا..... وہ آج کل اسی ایک کام کے پیچھے لگے ہوئے تھے..... مختلف جامعات کی ویلفیئر سوسائٹیز سے رابطہ کر چکے تھے۔ کئی نوجوانوں کا انٹرویو لے چکے تھے لیکن ابھی تک ان کے معیار پر کوئی پورا نہیں اتر سکا تھا..... انہوں نے ایک جامعہ کی امید نامی ویلفیئر سوسائٹی سے بھی رابطہ کیا تھا اور آج امید کی نمائندہ ٹیم ان سے ملنے آنے والی تھی۔ وہ پانچ لڑکوں اور تین لڑکیوں کا گروپ تھا۔ اور چیئر مین کے کاموں کے لیے کافی فعال تھا۔ عبدالحمید ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے تھے..... یوں سمجھ لیجیے کہ... عبدالحمید اور وہ آٹھواں پزل کے وہ دو ٹکڑے تھے جنہیں باہم مل کر تصویر مکمل کرنی تھی..... لیکن نہیں..... ایک چھوٹا سا حصہ ابھی مس تھا..... چھوٹا ضرور تھا مگر پتا اس کے تصویر مکمل نہ ہو سکتی تھی۔

”میں آپ کو اپنی پوتی سے ملواتا ہوں..... آپ ہی کی جامعہ کی طالب علم ہے۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے آواز دی تھی۔ ”غزل.....!“ اور چند لمحے بعد ان آٹھوں کے آٹھوں کی آنکھوں نے سیاہ لباس میں ملبوس ایک وجود کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔

”السلام.....“ اور غزل کا سلام ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے حیرت کے بھر پور تاثر کے ساتھ سنگل صوفے پر بیٹھے اس شخص کو دیکھا تھا۔

”السلام علیکم!“ ترنت اس نے خود کو کپوز کیا تھا اور حلق میں انک کر رہ جانے والے سلام کو برآمد کیا تھا۔

وہ مانی تھا اور وہ بھی کم و بیش اسی کیفیت کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ تصویر مکمل ہو چکی اب..... عبدالحمید نے اس کا تعارف کروایا تھا۔ ان آٹھ میں سے چار اسے جانتے تھے اور ان چار میں مانی سرفہرست تھا۔

”مس غزل کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے سرا“ یہ مانی تھا۔



## عنان گیر

”مجھے..... دے دیں، میں کر لاؤں گی۔“ وہ اب کے اندر آتے ہوئے بولی تھی۔

”ارے نہیں، سارے تھوڑی آپ کریں گی..... مل کر کریں گے۔ ہم لوگوں کا پروگرام ہے کہ راحیلہ کے گھر پر اکٹھے ہو کر یہ سارے کام نمٹالیں..... سب آرہے ہیں تو آپ بھی وہیں آجائیے گا.....“ وہ سہمی تھی۔

”میرا آنا تو مشکل ہے سہمی! آپ مجھے کپڑے دے دیجیے، میں ریڈی کر کے پہنچا دوں گی۔“ اس نے شائستگی سے معذرت کی تھی۔ اور اس معذرت پر سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس طرح سے دیکھا کہ جیسے کہتے ہوں..... ”ہمیں پتا تھا کہ غزل مراد نہیں آنے والی۔“

”یہ غلط بات ہے..... تمہیں سب کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے..... یہ بھی تو لڑکیاں ہیں..... ہمارے ساتھ مل کر ہی کام کرتی ہیں اور ہم کھا نہیں جاتے ان کو..... جو یوں تم اوائڈ کر رہی ہو۔“ سدا کا منہ پھٹ اور ماڈرن ازم کے شدید بخار میں مبتلا وہ قمر تھا..... اسے سخت ناگوار گزرا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا..... کام کرنا ہے تو مل کر برقع چھوڑ آئے مگر ورنہ نہ آئے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ واقعی میں مجھے کھا تھوڑا ہی جائیں گے۔ لیکن ایک بات تو بتائیں آپ کی دلچسپی کام کے ہونے میں ہے یا اکٹھے ہونے میں ہے؟“

لو بیٹا اب تم بھی چھکو ذرا..... بے عزتی کا مزہ..... لہجہ سرد ہونے کے باوجود اگلے کو تپا کر رکھ دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھا..... ماحول گرم سا ہونے لگا تھا اور وہ ساتوں پریشان۔

”میں نے کہا تھا ناں اسے رہنے ہی دو..... یہ discriminate کرے گی..... لیکن نہیں..... یہ عبد الحمید کی پوتی ہے سو اسے لازمی شامل کرنا ہے۔“ قمر بھڑک اٹھا تھا..... غزل کا دل چاہا وہ اسے منہ لگائے بنا آگے بڑھے..... کپڑوں کا تھیلا اٹھائے اور نکل جائے لیکن نہیں..... یہ اس کا اسٹائل نہ تھا۔

”ہاں..... میں عبد الحمید کی پوتی ہوں اور ہاں مجھے کوئی شامل نہ کر کے دکھائے ذرا..... میں کروں گی تفریق اور اس سے بھی کوئی مجھے روک کر دکھائے.....“ قمر کی

”میری بیٹی فخر ہے میرا۔“ عبد الحمید صاحب نے لاڈ سے اسے ساتھ لگایا تھا اور غزل کا جھکا سر مزید جھک گیا تھا۔ دادا سے یوں پیار کرتے تھے جیسے وہ بائیس سال کی نہیں دو سال کی ہے۔ چلو گھر میں تو سب چلتا ہی ہے مگر یوں..... سب کے سامنے..... وہ ٹھیک ٹھاک بلش ہوئی تھی۔

”دادا.....“ اس نے احتیاجاً دادا کو گھور کر دیکھا تھا یوں جیسے کہتی ہو..... لوگوں کے سامنے تو خیال کر لیا کر لیں مگر وہاں پروا کسے تھی۔ دادا ان سے ڈسکس کرنے میں مصروف ہو چکے تھے..... کون سی جگہ پر دیوار چنی جائے..... پینٹ کون کرے گا، اینگرز اور کھونٹیوں کا بندوبست، مینجمنٹ، کپڑے کہاں سے لیے جائیں گے..... کون، کیسے اور کیا..... اکٹھا کرے گا..... وہ چاہتے تھے کہ یہ سب آج کی میٹنگ میں ہی فائنل ہو جائے..... وہ جلد از جلد یہ دیوار بنانا چاہتے تھے..... غزل اور راحیلہ کے ذمے عورتوں کے کپڑے اکٹھے کرنے کی ذمے داری لگی تھی۔ وہ آٹھ سے نو ہو چکے تھے اور مانی کو اسی گفتگو کے دوران معلوم ہوا تھا کہ غزل، دادا کے ساتھ جیسٹریٹ کے کاموں میں معاونت کرتی رہی ہے..... یوں سمجھ لیجیے کہ وہ ان کی سیکریٹری تھی۔

☆☆☆

وہ لائبریری میں کتاب ہاتھ میں لیے فقہ کے کسی مسئلے میں الجھی بیٹھی تھی کہ دفعتاً سامنے میز پر پڑا سیل تھر تھرا اٹھا تھا۔ اس نے کوفت سے اس تھر تھرا ہٹ..... کو دیکھا۔ سیل اٹھا کر انگوٹھے سے swipe کیا تو وہ راحیلہ کا میسج تھا۔ ”come in office“ اس نے بیچاریگی سے سامنے کھلی کتابوں کو دیکھا اور پھر میسج کی شکل میں موجود ان الفاظ کو.....

”آتی ہوں.....“ کا میسج بھیج کر اس نے چیزیں سمیٹیں..... کتابیں دوبارہ واپس رکھیں اور پیروں نے... موسائی کے آفس کا رخ کیا تھا۔

”جی راحیلہ.....“ وہ اندر نہیں گئی..... دروازے پر کھڑے، کھڑے ہی اس نے پوچھا لیا تھا۔

”آپ اندر تو آئیں۔“ وہ راحیلہ نہیں مانی تھا۔

”اٹس اوکے..... مجھے کچھ کام ہے..... آپ بتائیں؟“

”یہ کپڑے ہیں ان پھوہڑ لڑکوں نے ہمارے ذمے نہیں اربن کرنا لگا دیا ہے۔“ راحیلہ شرارت سے بولی تھی۔



آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے اپنے ازلی پرسکون مگر ٹھنڈے لہجے میں اپنی بات کہہ دی تھی۔ پھر آگے بڑھ کر آنا فانا کپڑوں کے تھیلے اٹھائے اور یہ جا..... وہ جا.....

”بجھتی کیا ہے خود کو..... ہے کیا چیز؟“ قمر مشتعل ہو کر بول رہا تھا۔ اور وہ سن سکتی تھی مانی کی آواز.....

”یار قمر کیا ہو گیا ہے..... کچھ تو تمیز کر.....“ مگر قمر..... وہ زہر بھی تھوکتا تو بھی غصہ کم نہ ہوتا اور لڑکیاں..... وہ اس کی جرأت پر اس، اش کراٹھی تھیں۔ تھپڑ مار کر گئی تھی وہ قمر کے منہ پر.....

”میں دیکھتا ہوں وہ کیسے لے کر جاتی ہے کپڑے.....“ قمر سرخ خون منہ لے کر بازو چڑھاتے ہوئے اس کے پیچھے جانے کے واسطے اٹھا تھا۔

”اوئے..... اوئے.....“ اور وہ چاروں کے چاروں اس پر یہ پل پڑے تھے۔

”تم لوگ اس کا..... اس کا فیور کر رہے ہو.....“ وہ غزل کے پیچھے جانا بھول کر صدمے سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔ ”قمر بیٹھ جا.....“ مانی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھانا چاہا اس نے غصے سے خود کو چھڑوا لیا۔

”کول ڈاؤن یار..... کول ڈاؤن..... ریلیکس.....!“ مانی نے اب کہ اس کا گال تھپتھایا۔

”مجھے یقین نہیں آرہا..... تم لوگ مجھے جھوڑ کر اس کا فیور.....؟“ ”اسٹاپ! قمر.....!“ مانی نے بری طرح سے ٹوکا تھا۔

”فیور اس کا صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ یہاں تم غلط ہو، وہ نہیں..... وہ ہوتی تو تمہارا فیور کرتے..... کام چاہیے ناں ہمیں..... تو وہ جیسے مرضی کرے، ہمیں کیا..... نہیں آنا چاہتی ہمارے ساتھ تو تمہیں اعتراض کیا ہے؟“ یہ ان کے گروپ کا تھا قاسم تھا۔

”تم اسے ٹیز کرنا چاہتے تھے ناں قمر؟“ مانی کے یوں براہ راست کہہ دینے پر قمر کا منہ مزید لال ہوا تھا۔

”جبکہ تم جانتے بھی تھے کہ وہ راحیلہ، سلمیٰ کی طرح نہیں ہے۔ ایک مہذب انسان ہونے کے ناتے تمہیں اس چیز کا احترام کرنا چاہیے.....“

”بھاڑ میں جاؤ تم لوگ..... رکھو اسے ہی پھر۔“ طیش سے کہتے ہوئے..... وہ کرسی کولات مارتے ہوئے بولا تھا۔

”تمہارا مطلب کیا ہے اس بات سے؟“ راحیلہ نے تنک کر قمر سے پوچھا۔

”مطلب صاف ہے اور پھر بھی تم پوچھتی ہو راحیلہ.....!“ مانی نے طنز کیا تھا۔

”غزل کہیں نہیں جائے گی اور وہ جیسے چاہے گی کام کرے گی۔ تمہیں اعتراض ہے تو بتا دو.....“ یہ گروپ کی تیسری لڑکی منال تھی۔

”تم لوگوں کو عبد الحمید کے فنڈز نظر آرہے ہیں دوست نہیں۔“

اور قمر کے اس گھٹیا الزام پر وہ سب ساکت کے ساکت رہ گئے تھے۔

”گیٹ آؤٹ!“ وہ مانی تھا جس نے یک دم شاؤٹ کیا تھا۔ ”ہاں.....! آ رہے ہیں نظر ہمیں فنڈز.....“ اور جب قمر تن فن کرتا ہوا باہر نکلا تو مانی پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔

”I can't believe this“ منال صدمے نما حیرت سے بولی تھی۔

ماڈرن ازم کے سینے پر جب تک چیئر بی کا تمغہ نہیں بچتا تو انسان انسانیت کا علمبردار نہیں بناتا..... اور حال یہ کہ ذہن کے دیسی پن سے نجات تک نہیں پاسکتے۔ چیئر بی ورک کسی تمغے، کسی ستائش کے لیے نہیں کیا جاتا..... اور جو کیا جاتا ہے وہ کم از کم چیئر بی ورک نہیں ہوتا..... اس کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے..... یہ احسان نہیں..... فرض ہے اور یہ سب کے بس کی بات کہاں.....

☆☆☆

”غزل.....!“ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور سر اٹھاتے ہی حیرت اس کی آنکھوں سے آن چٹی تھی۔ وہ سب باجماعت حاضر تھے اس نے سوالیہ نظروں سے منال کو دیکھا۔

”وہ..... ہم سوری بولنے آئے تھے۔“ راحیلہ ایک قدم آگے بڑھی تھی۔

”کس بات کے لیے؟“ غزل مزید حیران ہوئی اور وہ سب مزید شرمندہ.....

”قمر کے مس بی ہویری کی وجہ سے۔“ ”تو وہ اس نے کیا تھا..... آپ سب نے تو نہیں ناں، اس اوکے.....“



”ہمیں لگا آپ ہرٹ ہوئی ہوں گی۔“ وہ راحیلہ تھی۔  
 ”عادت ہے مجھے ایسے روتیوں کی..... ہرٹ نہیں  
 ہوتی میں۔“ جواباً وہ نرمی سے بولی تھی۔ ”اپنی ہاؤ..... آپ  
 لوگوں کا شکریہ.....“  
 ”آپ جیسے چاہیں کام کر سکتی ہیں، قمر تو ویسے بھی اب  
 جا چکا ہے۔“

”اس کے ہونے سے مجھے فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔“  
 ”وہ تو ہمیں معلوم ہی ہے۔“ سلسلی مسکرا کر کہتے  
 ہوئے اس کے پاس بیٹھ کر ہی بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ  
 ہی منائل اور راحیلہ بھی بیٹھی تھیں۔ لڑکے سارے  
 دوسری بیٹھ پر بیٹھے تھے سوائے مانی کے۔ وہ سیٹ پر  
 پاؤں رکھ کر بیٹھ کے ٹیک لگانے والے حصے کے اوپر بیٹھا  
 تھا۔ غزل ایک بار پھر حیران ہوئی تھی۔ وہ سب تو جم کر  
 بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

”ہم نے سوچا یہیں پہ میٹنگ کر لیتے ہیں۔ کام تو  
 سب ہو چکا بس اب اوپن کرنا ہے.....“ پھر وہ اوپننگ  
 کے حوالے سے سب کچھ طے کرنے میں مشغول ہو گئے  
 تھے۔ اسی چکر میں غزل کا ایک پیڑ بھی گیا تھا..... نہ  
 صرف غزل وہاں موجود دوسرے طالب علموں کا بھی.....  
 مگر انہیں آج ہی سب کچھ مکمل کرنا تھا..... اور وہ ایک،  
 ایک کر کے وہاں سے اٹھنے لگے۔ آخر میں منائل، غزل اور  
 مانی رہ گئے تھے۔ منائل کو اس کا عبا یا بے حد پسند آیا تھا اور  
 وہ شاپ کا نام پوچھ رہی تھی۔

”تمہیں لینا ہو تو بتانا..... میں لے چلوں گی۔“ غزل  
 اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاؤ سویٹ.....!“ منائل تشکر کے جذبات سے  
 دہری ہوئی تھی اور یہ تو اس کی عادت تھی کہ کوئی بات سویٹ ہو  
 یا نہیں ہو اس نے ”ہاؤ سویٹ“ ضروری کہنا ہوتا تھا..... وہ  
 ویسے بھی لڑکی کم اور بچی زیادہ دکھتی تھی۔ اس ادا پر غزل نے  
 پیار سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔ اپنے جرنلز اٹھائے بیگ  
 کندھے پر ڈالا اور جوں ہی واپس مڑنے لگی تھی۔

”ایکسیکوزی غزل!“ کی آواز پر غزل تو غزل، منائل  
 نے بھی حیرت سے مانی کو دیکھا تھا۔ غزل کے یوں دیکھنے پر  
 وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سر جھکائے تھوڑا

آگے بڑھا تھا۔

”آئم سوری.....!“ پھر اسی جھکے سر کے ساتھ کہا گیا تھا۔  
 اب یہ کون سا والا سوری تھا..... غزل نا سمجھ نظر آئی اور  
 پھر نا سمجھی سوال بن کر آنکھوں میں ابھری تھی اور اس سوال پر  
 مانی نے منائل کو دیکھا..... اس کے سامنے ”اعتراف“ تو  
 مشکل تھا۔ لیکن جی کڑا کر کے مانی نے کہہ ہی دیا تھا۔

”میں اپنی حرکت پر شرمندہ ہوں.....“ وہ پوچھتا  
 چاہتی تھی ”کون سی؟“ مگر یک دم اک کلک ہوا اور اسے وہ  
 دن یاد آ گیا تھا۔ بے اختیار اس نے گہری سانس بھری تھی۔  
 وہ مانی کو بھی یہی کہنا چاہتی تھی کہ مجھے فرق نہیں پڑتا..... لیکن  
 نہیں کہہ سکی..... اس کی شرمندگی نے اسے کہنے سے روک دیا  
 تھا۔ کسی کا سوری قبول کر لینا بھی اخلاق ہی ہوتا ہے۔

”عبا یا والی ہو..... دوپٹے والی یا ہنا دوپٹے والی.....  
 وہ حرکت ہر کسی کے لیے برابر بری تھی بہر حال میں سمجھ سکتی  
 ہوں۔“ اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے لاشعوری طور پر مانی  
 کو دیکھا تھا۔ مانی کو کرنٹ لگا..... تو اس نے سن لیا تھا.....  
 اس نے بھی لاشعوری طور پر غزل کو دیکھا اور.....  
 ”اٹس اوکے.....“ وہ کم کرر کی نہیں تھی۔ تیز، تیز قدم  
 اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

”اوئے مانی کے بچے.....“ منائل اسے تاڑتے  
 ہوئے اٹھی اور اپنا فولڈر اس کے کندھے پر دے مارا تھا۔  
 ”کیا، کیا تھا تم نے غزل کے ساتھ..... بولو.....  
 بتاؤ.....“ منائل اور جان چھوڑے دے..... یہ بھلا کب ہوا  
 تھا..... مانی کے چہرے پر بے ساختہ آف والے تاثرات نمودار  
 ہوئے تھے..... اس وجہ سے وہ اس کے سامنے کہنا نہیں چاہتا تھا  
 مگر اب کیا ہو سکتا تھا..... وہ منائل نہیں نفارہ تھی نفارہ.....

☆☆☆

میں سوچتی ہوں کہ کیا محبت..... عجب کام ہے، عجب  
 احساس ہے..... اور جب یہ کام، یہ احساس ہوتا ہے تو کیا  
 اس کا ہونا بھی عجب ہے مگر عجب نہیں تو اتنے قصے، اتنی  
 کہانیاں کیوں.....؟ اگر کوئی پوچھے کہ محبت کیا ہے تو میں  
 کہوں..... معلوم نہیں کیا ہے؟ سائنس نہیں..... کلیہ نہیں،  
 کوئی کائنات کا مخفی اسرار بھی نہیں مگر پھر بھی..... پھر بھی سمجھ  
 میں نہیں آتی..... ہے تو بس ہے..... نہیں ہے تو نہیں، مجبور



نہیں کیا جاسکتا کہ محبت آ! اور دل میں سما جا..... اپنا آپ کھول دے، من کو بھگو دے، سرشار کر دے..... اور جب ہو جائے تو دل سے نکالنا مشکل..... ہاتھ جوڑو، ناک کی لکیریں نکال لو..... متیں کرلو یا فریاد..... ہے تو بس ہے..... یہ نہیں جاتی پھر کہیں جم کر بیٹھ جاتی ہے..... آسیب کی طرح حاوی رہتی ہے..... کسی چیز سے، کسی بات سے نہیں ٹلتی..... اور جب یہ نہیں ٹلتی تو میں سوچتی ہوں کہ کیا محبت عجب کام ہے؟ عجب احساس ہے.....؟ نہیں..... یہ عجب نہیں ہے..... یہ انسان کے خمیر کا حصہ ہے..... جذبات کی ملکہ ہے، فطرت ہے، کب، کہاں کیسے..... کس طرح سے جاگ اٹھے، کس کے اختیار میں ہے کہ یہ بے اختیاری شے ہے۔ تو یہ طے ہوا، یہ عجیب نہیں ہے، انسانی فطرت کا حصہ ہے ایک دل کش احساس ہے..... وہ چیز ہے کہ جس کا سبب تلاش نہیں کیا جاسکتا..... سر اڈھونڈا نہیں جاسکتا..... یہ ایسی ہی شے ہے کہ جیسے کسی چیز کو قفل لگا کر چابی سمندر میں پھینک دی جائے..... تو یہ طے ہوا محبت کا ہو جانا عجب نہیں لیکن یہ محبت، عجب ہوتی ہے مگر کب.....؟ تو محبت تب عجب ہوتی ہے جب یہ.....

☆☆☆

آج دیوار کی اوپنگ تھی۔ سب چاہتے تھے کہ۔۔۔ عبدالحمید صاحب فیتہ کاٹیں مگر انہوں نے انکار کر دیا..... یہ فیتہ کاٹنے والی چیز تو نہیں تھی..... یہ لوگوں کے لیے ہی تھی۔ آئندہ لوگوں نے ہی اسے چلانا تھا، وہ تو موبلائزر (چلانے والے) تھے اور بس..... تو پھر وہ دیوار اوپن کر دی گئی..... نہ فیتہ کاٹا گیا نہ ہی کچھ اور..... بس اس طرح سے کہ جب ایک صبح شہر کے باسی اٹھے اور جیسے، جیسے وہ اس دیوار کے پاس سے گزر کر جانے لگے تو دیوار نے انہیں گزرنے نہیں دیا، پکڑ لیا..... اور کہا کہ وہ ایک نظر..... ذرا سی توجہ کی مستحق تو ہے ہی..... وہ دیوار خود اپنی تشہیر تھی..... نیکی، اچھائی، بھلائی ایک خوشبو ہے۔ بھلا خوشبو کو پھیلنے سے کوئی روک سکا ہے آج تک.....؟ خوشبو کو قید کیا جاسکتا ہے؟ بھلا ایسا کب ہوا ہے۔ تو وہ دیوار..... دیوار نہ تھی۔ خوشبو بھی خوشبو جو ہر گزرنے والے کو پکڑ لیتی تھی۔ کچھ نے کپڑے لیے، کچھ نے جوتے اور عادی ان کو..... کہ جن کے دم سے وہ اینٹ

اور سینٹ کی تعمیر خوشبو کھلائی تھی..... غزل بذات خود وہاں اسے دیکھنے آئی تھی..... وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جب کوئی پھٹے پرانے کپڑوں والا وہاں سے نکل لباں اٹھائے گا..... جب کوئی ننگے پیر والا کوئی جوتا، چپل اٹھائے گا تو اس کے چہرے، اس کی آنکھوں میں کیا احساس ہوگا..... اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس احساس کو جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گی تو کیا محسوس کرے گی..... اس نے اپنے دل میں اتنی ٹھنڈک، اتنی راحت محسوس کی تھی کہ ہر پیش، ہر آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی..... چاہے ایک پل کو ہی سہی..... اس نے راحت کے اصل مفہوم کو جانا تھا اور وہیں کھڑے، کھڑے اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اسے زندگی کا دوسرا کام کر کوئی کرنا تھا تو وہ لوگوں کی فلاح کا کام تھا..... کیونکہ پہلا کام تو phd کی ڈگری حاصل کرنے کا تھا۔

☆☆☆

”اوائے قاسم! توجٹ ہے ناں.....؟“  
”ہاں.....“ قاسم نے سینہ پھلا کر کہا تھا..... وہ الگ بات کہ سینہ پھلانے پر بھی 16 کا 16 انچ ہی رہا تھا۔

”تو پھر شرٹ کا اوپری بٹن بند کیوں رکھتا ہے؟ میری طرح کھول کر پھرا کر ناں.....“ وہ انصر تھا..... عاصم نے کچھ نہ کہا تھا، وہ چہرے پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ لیے کسی پھنے خان کی طرح انصر کے سامنے کھڑا ہوا۔ دونوں ٹانگیں ذرا سا پھیلا کر پھر ایک تمسخراتی نظروں سے انصر کو دیکھا اور ہاتھ..... گریبان کے پہلے بٹن تک گیا تھا۔ اس نے پہلا بٹن کھولا..... پھر دوسرا..... پھر تیسرا..... اور انصر کا منہ بھی ہر کھلنے والے بٹن کے ساتھ، ساتھ مزید سے مزید کھلتا گیا..... بالآخر وہ سارے..... کے سارے بٹن کھولے اپنا سولہ (16) انچ کا سینہ اس کے سامنے پھلا کر کھڑا تھا۔ توجٹ نہ ہو کر ایک بٹن کھول کر پھرتا ہے تو پھر میرا اتنا تو بنتا ہی ہے۔“ ایک لمحے کی خاموشی اور دوسرے ہی لمحے وہاں سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا تھا۔ وہ الگ بات کہ لڑکیوں کی بھی، لڑکوں کی ہا ہا میں کہیں دب گئی تھی۔ وہاں ایک عجب بے ترتیبی کا سا منظر تھا..... منال اپنے ٹیب کے ساتھ مصروف تھی۔ راحیلہ اور سلمیٰ کسی مووی پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ مانی کرسی پر نیم دراز تھا جبکہ ٹانگیں میز پر استراحت فرما رہی تھیں۔ انگوٹھے الگ سیل



## عنان گیر

کیا تھا..... راحیلہ کے پیٹ میں بل پڑا اور وہ ہلسی کودبانے کی کوشش میں محض کراہ کر رہ گئی تھی۔

”کیا ہوا.....؟“ سلمیٰ نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔

”قاسم کو دیکھو.....!“ اور راحیلہ کا حلق بات کی

اجازت نہ دیتا تھا وہ اک فلک شکاف قہقہہ لگا کر اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر آہ..... یہ نہیں ہو سکتا تھا، فی الحال تو نہیں..... اور غزل کہہ رہی تھی۔

”میں کچھ بچوں کو پڑھاتی ہوں..... وہ سب بچے ایسے ہیں کہ اسکول جانا انورڈ نہیں کر سکتے یا پھر کسی بھی طریقے سے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے..... میں پچھلے ایک سال سے ان بچوں کو پڑھا رہی ہوں اور.....“ اور مانی کو یک دم کسی غیر معمولی صورت حال کی بو آئی تھی..... وہ سب سر جھکائے غزل کو سن رہے تھے۔ چلو سننے کی حد تک تو ٹھیک تھا..... لیکن اتنے ادب کا مظاہرہ.....؟ اس نے سامنے بیٹھے علی کو دیکھا..... وہ دونوں بازو..... پیٹ پہ کس کر باندھے تقریباً نیم رکوع کی حالت میں تھا..... منا ہل ہونٹ کا کونہ دانتوں میں دبائے ہوئے تھی..... راحیلہ ناخن چبا رہی تھی اور سلمیٰ..... وہ مانی کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ مانی نے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہے۔

اشارے کا جواب پھر سے آیا..... ”قاسم.....!“ اور جب مانی نے جواب یعنی قاسم کو دیکھا تو..... تو وہ بیچارہ بھی محض کھانس کر رہ گیا تھا۔ اب قاسم واحد تھا جو بڑے اطمینان سے غزل کو سن رہا تھا جو کہہ رہی تھی۔

”میں اپنی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے اس سلسلے کو جاری نہیں رکھ پا رہی..... تعطل کا شکار رہنے لگا ہے یہ کام..... میں چاہ رہی تھی کہ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی میری اس کام میں مدد کرنا چاہے تو میرے لیے ان بچوں کو بنیادی تعلیم سے روشناس کروانا آسان ہو جائے گا۔“

”کل کتنے بچے ہیں؟“ صرف قاسم ہی پوچھنے کی حالت میں تھا۔

”زیادہ نہیں ہیں..... فی الحال تو دس ہی ہیں۔“

”آپ ہم سے کیا چاہ رہی ہیں؟“ اور اس سوال پر غزل نے بے اختیار سر اٹھا کر قاسم کو دیکھا اور..... اور ترنت اس نے سر دوبارہ جھکایا تھا..... اک لمحے کا توقف.....

کے ساتھ مصروف تھے۔ علی ٹیبل کے اوپر چوڑی مارے بیٹھا تھا اور انہرا اور قاسم اس وقت آمنے سامنے کھڑے قدرے بہتر حالت میں تھے۔

”اوائے غزل!“ ان میں سے یک دم کوئی بولا تھا۔ اور وہاں جیسے یک دم اک ہڑ بونگ نے حملہ کر دیا تھا۔ مانی نے ٹانگیں جلدی سے نیچے کرنا چاہیں مگر اس کی جلدی اتنی جلدی وقوع پزیر..... نہ ہو سکی تھی..... نتیجتاً اس کے گھٹنے میز کے کنارے سے ٹکرائے تھے۔ علی چھلانگ مار کر ٹیبل سے اترا اور قاسم..... یوں لگتا تھا ہڑ بونگ کا سب سے شدید حملہ اس پر ہوا تھا۔ وہ کبھی سامنے سے آتی غزل کو دیکھتا اور کبھی اپنے ہاتھوں کو..... جو کہ حتی الامکان تیزی سے شرٹ کے کھلے بٹنوں کو بند کرنے میں مصروف تھے۔ انہر نے بھی جلدی سے شرٹ کے واحد کھلے بٹن کو بند کیا تھا۔ وہاں جیسے یک دم اک ایمر جنسی نافذ ہوئی تھی اور غزل کے اندر آنے تک وہ سب تمیز دار بچے بن چکے تھے۔ قاسم اک گہری سانس لے کر پلٹا اور مانی کی کرسی کے آگے کھڑا ہوا..... تو وہ بھی کامیاب ٹھہرا تھا۔

”السلام علیکم.....!“ غزل نے سب کو سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام.....!“ مشترکہ جواب آیا تھا۔

”مجھے ایک کام تھا آپ لوگوں سے.....“ حسب عادت دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے کہا تھا۔

”جی کہیے.....“ وہ راحیلہ تھی۔

”میں اندر آ سکتی ہوں؟“

”ہیں.....؟“ حیرت ایک جست میں ان کے چہروں پر نمودار ہوئی تھی۔

”وائے ناٹ..... شیور.....“ منا ہل کہتے ہوئے

اٹھی اور جیسے ہی وہ قاسم کے پاس سے گزرنے لگی تو..... بے اختیار اس نے منہ ہاتھ رکھ کر اپنی ہلسی کو روکا تھا..... علی نے اسے آنکھیں نکالیں..... جواباً اس نے آنکھوں سے ہی قاسم کی طرف اشارہ کیا تھا..... اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ علی بے اختیار جھک کر کھانا تھا اور اسی نیم رکوع کی سی حالت میں اس نے اپنے ہونٹوں کو حتی الامکان پھیلنے سے روکا تھا..... علی کی یک دم کھانسی نے راحیلہ کو مجبور کیا کہ وہ اسے پانی کا گلاس پکڑائے..... آخر کو وہ اسے پسند جو کرتی تھی اور پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے علی نے راحیلہ کو بھی اشارے سے متوجہ



”نہیں یہ چاہ رہی تھی کہ آپ لوگ ایک، ایک کر کے  
 ۱۰۱ ہاری ان بچوں کو وقت دے سکیں تو یہ کام بہت آسان  
 ”ہاں گا۔“

”ٹھیک ہے میں تو دلگ ہوں..... آپ باقیوں سے  
 ہم لیں۔“ قاسم نے کہتے ہوئے جب دیگر احباب کو دیکھا  
 تو اسے یہ کیوں محسوس ہونا تھا کہ کچھ تھا جو کہ ٹھیک نہ  
 تھا..... کچھ تھا جو کہ غلط تھا..... صحیح نہ تھا..... اور ٹھیک عین اسی  
 بل اس پر یہ بھی انکشاف ہوا تھا کہ تب سے اب تک وہ ہی  
 رہا تھا اور غزل کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔  
 ”کیوں مانی.....؟“ اس نے رخ موڑ کر اپنے  
 اس اس کو دباتے ہوئے مانی سے پوچھا۔

”جی، کیوں.....“ اور مانی قابو نہ رکھ سکا تھا۔ بے اختیار  
 وہ قہقہے کا گلا گھونٹ کر ہنسا تھا اور مانی کا ہنسا، ہنسانہ تھا..... سنگتل  
 تھا کہ لو بھئی..... اب اجازت ہے سب شروع ہو جاؤ..... تو وہ  
 سب سنگتل کو گرین پاتے ہی شروع ہو گئے تھے۔ وہاں پر ایسا  
 ہنسی کا دورہ پڑا تھا کہ جو قابو سے باہر نظر آئی تھی۔  
 ”آئی ایم سوری غزل.....!“ اس کے ساتھ بیٹھی سلمیٰ  
 نے بہ مشکل کہا اور پھر سے لوٹ پوٹ.....

اور غزل..... وہ بھی یوں ہنسنے کی وجہ سے واقف تھی مگر  
 یہ کہ وہ ان سب سے زیادہ ضبط کرنا جانتی تھی۔

”اٹس اوکے.....! آپ لوگ فیصلہ کر کے بتا دیجیے  
 گا.....“ وہ اٹھی اور راحیلہ سے کہتے ہوئے باہر نکل آئی تھی اور  
 غزل کے جاتے ہی ایک اور فلک شکاف قہقہہ گونجا تھا یوں  
 جیسے سب کو کھل کر ہنسنے کا موقع اب ملا تھا اور قاسم..... وہ ہکا  
 بکا ان سب کے چہروں کو باری، باری تکتا تھا۔ حیرت اتنی  
 شدید تھی کہ وہ پوچھ بھی نہ پایا کہ کیا ہوا..... وہ بس ہونق بنا  
 ایک، ایک کا چہرہ دیکھتا تھا۔

”مجھے ہنسی کیوں نہیں آرہی؟“ اس نے اسی حیرت  
 کے ساتھ سوال کیا۔

”اس لیے.....“ منال نے اپنا میک اپ مرر عین اس  
 کی شرٹ کے سامنے رکھا تھا اور.....

ایک لمحے کو اس کا منہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے وہ قہقہہ  
 لگا کر ہنسا اور تیسرے ہی لمحے..... اس کے قہقہے کا گلا گھٹ کر  
 رہ گیا تھا۔

”غزل بھی یہاں تھی..... اوہ مائے گاڈ اس نے بھی  
 دیکھا ہوگا.....“ وہ بڑبڑایا تھا۔

”ہاں..... اس نے بھی دیکھ لیا تھا بچے.....“ سلمیٰ نے  
 پکار کر کہا تھا۔ اور قاسم عمر بھر شرمندگی میں غرق ہو کر رہ گیا تھا۔  
 غزل کی آمد کی وجہ سے جو ہڑبونگ مچی تھی اور جس کا شدید  
 حملہ قاسم پر ہوا تھا اور اس شدید حملے میں اس کے ہاتھ سب  
 سے زیادہ متاثر ہوئے تھے جو کہ شرٹ کے بنٹوں کو صحیح طرح  
 سے بند کرنے سے قاصر رہے تھے اور اب وہ یوں بند تھے کہ  
 شرٹ خواہ مخواہ میں ہر کسی کا منہ چڑاتی ہوئی دکھتی تھی..... سو  
 اب سر پکڑ کر وہاں بیٹھا قاسم تھا اور ان ساتوں کی پھبتیاں  
 تھیں اور قہقہے تھے۔

☆☆☆

”غزل!“

”جی اماں.....!“ ان کے پکارنے پر وہ یک دم  
 سیدھی ہو کر بیٹھی تھی۔

”کیا بات ہے، کچھ سستی لگتی ہو۔“ وہ اس کے...  
 پاس آ کر بیٹھی تھیں۔

”نہیں بس تھک گئی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے  
 جواب دیا۔

”تھکتی تو تم روز ہی ہو..... مگر یوں اداس نہیں  
 ہوتیں۔“ انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے بالوں کی  
 لٹ کوکان کے پیچھے اڑسا تھا۔

”تو سمجھیں آج تھکاوٹ نے مجھے اداس کر دیا.....“  
 وہ ہلکی سی شگفتگی سے بولی تھی۔

”نہیں، تھکاوٹ بس تھکاتی ہے غزل..... اداس نہیں  
 کرتی۔“ اماں کا لہجہ نرم مگر جتنا ہوا تھا۔

”یونیورسٹی کے لوگ عجیب سے ہیں اماں..... ان  
 کے رویے تکلیف دہ ہیں، میرے نہ ہونے پر وہ کن سوئیاں  
 لیتے ہیں اور ہونے پر انگلیاں اٹھاتے ہیں..... میں دہشت  
 گرد، انتہا پسند لگتی ہوں انہیں.....“ اس کا لہجہ آنچ دیتا تھا۔

”تم تو ایسی باتوں سے ہرٹ نہیں ہوتی نہیں بچے؟“  
 ”انسان ہوں اماں..... تھک سکتی ہوں اور تھک کر

اداس بھی ہو سکتی ہوں.....“ اس نے جیسے جتنا تھا۔ اماں یوں  
 مسکرائیں جیسے اعتراف کرتی ہوں ہاں بھی جان لیا کہ



آنسو گال کی نذر کیا تھا۔

کوششیں یوں بھی راگیاں جاتی ہیں..... غزل مراد  
تے جان لیا تھا۔

☆☆☆

”اوائے مانی!..... where the hell are you“ اور گن کر پورے پانچ جھانپڑ مانی کے منہ پر پڑے  
تھے کیونکہ کہنے والی زارا تھی اور ذرا غصے میں دکھتی تھی۔  
”ہائے، پھر سے کہو ناں زارا..... میں فدا تمہاری  
انگریزی ہے۔“ مانی مدتے داری ہوتے ہوئے بولا تھا۔  
”بکومت.....!“ وہ زارا ہی کیا جو ذرا سی بھی شرمندہ  
ہو جائے۔

”تھے کہاں تم..... اتنے دنوں سے نظر ہی نہیں آئے  
ہو..... کل تمہاری approxy لگواتے ہوئے یاد رکھا گیا  
تھا بھلا بتاؤ عثمان شاہد کلاس میں نہ ہو اور پتا بھی نہ لگے بری  
ہوئی اس کی اور اب وہ خونخوار ہو رہا ہے اور تمہیں ڈھونڈتا ہوا  
پایا گیا ہے۔“ سچ کر رہنا مانی پاجی.....“ زارا نے ایک سانس  
میں اسے پچھلے دو ہفتوں کی رپورٹ سنائی تھی۔  
”پر مانی پاجی..... تم تھے کہاں؟ نہ کوئی خبر.....“  
اور آخر میں زارا کی سوئی پھر وہیں آ کر اٹکی تھی۔

”امید“ کے کاموں کے سلسلے میں مصروف تھا۔“ مانی  
نے اس کی پلیٹ میں سے سموہ اڑاتے ہوئے کہا تھا اور  
حسب عادت کرسی پر نیم دراز ہو کر بیٹھا تھا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ غزل کے ساتھ بڑی تھا۔ امید  
کا نام تو بس بہانہ ہے۔“ ٹیٹا کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی  
تھی۔ مانی اک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

”شٹ اپ ٹیٹا.....!“ وہ بے حد برے انداز میں  
بولا تھا۔

”اتنے پوزیسیو کیوں ہو رہے ہو..... اک بات ہی  
کہی ہے۔“

”اور جو کہی ہے وہ بے حد غلط کہی ہے۔“ مانی نے  
ترنت جواب دیا۔

”اوہ کم آن مانی!..... کس کے حق میں بول رہے  
ہو..... وہ ایک دوغلی شخصیت ہے، ویسے تو خود کو یوں چھپا کر  
رکھتی ہے اور کام کرتی ہے مردوں کے ساتھ واؤ.....“ ٹیٹا پر

تھکاوٹ، اداس بھی کرتی ہے۔

”تم نے خود کو خود ہی اتنا الگ رکھا ہے۔ لوگوں میں  
گھلوملوگی تو وہ تمہارے بارے میں جاننے یا جانچنے کی نگ و  
do chhooz diں گے، تم نے سنا نہیں کیا..... the less  
you reveal the more people can  
“wonder

”میری نیچر ایسی نہیں..... آپ جانتی ہیں کہ میں  
بہت ان سوشل ہوں۔ دوسرے میری جس طرح کی اسٹڈی کی  
عادت ہے اور جو میرا سوشل ورک ہے، وہ مجھے اجازت نہیں  
دیتا کہ میں دوستیاں پالوں..... میں ایک وقت میں ایک کام  
ہی کر سکتی ہوں اماں..... dynamic پر سٹالٹی نہیں ہوں  
میں.....“ وہ صرف کورس کی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتی تھی۔  
وہ مختلف دینی ویب سائٹس اور یوٹیوب کے دینی چینلوں سے  
مدد لیتی تھی۔ اس نے کئی چینلوں پر subscription لے  
رکھی تھی۔ اس نے سچپارگی ظاہر کی.....

”اچھا چلو.....! کبھی، کبھی کا تھکنا بھی اچھا ہوتا ہے۔  
انسان کو بریک مل جاتا ہے اسی بہانے کچھ آرام تو کروں گی  
ناں.....“ اماں کہتے ہوئے اٹھی تھیں..... وہ جواباً مسکرائی۔

پھر اس نے اماں کے کمرے سے باہر جانے کا انتظار  
کیا..... جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئیں..... ایک گہری  
سائس بھر کر اس نے سامنے کھلی کتابوں کو بے دلی سے  
دیکھا..... اور انہیں بند کر دیا تھا۔ اٹھ کر اس نے کمرے کا  
دروازہ بند کیا..... لائٹ آف کی اور گھپ اندھیرے میں بستر  
پر چت لیٹ گئی..... دونوں ہاتھ سینے پر اور نظریں اور  
اندھیرے میں ہی نہ جانے کسی چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

”اداس.....“ اس نے زیر لب اس لفظ کو ڈھرایا اور  
حلق میں یک دم کچھ چبھا تھا..... وہ اس اک لفظ سے پچھلے  
کتنے دنوں سے بچ رہی تھی چھپ رہی تھی اور اماں نے اک  
پل میں اسے عیاں کر دیا تھا تو وہ اداس تھی..... تو کیا میں  
اداس ہوں؟ ہاں.....! میں اداس ہوں..... اور اس نے  
عیاں ہو جانا منظور کر لیا تھا۔ اس اداسی کا اعتراف جیسے کاٹ  
کر رکھ دینے جیسا تھا..... وہ بار بار حلق کو تر کرنے لگی.....  
ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر خود پہ قابو پانے کی کوشش کرنے  
لگی تھی لیکن..... کوشش راگیاں گئی..... اور آنکھ نے اپنا پہلا



پڑے گی۔

”مائے فٹ.....“ تنٹنا کر وہ اٹھی اور کرسی کو ایک لمبا  
رسید کرتے ہوئے وہ بھی چلی گئی تھی۔ باقی رہ گئی زارا تو اس  
نے پھر سے ایک نظر ٹینا کو دیکھا۔ دوسری نظر سے مانی  
کو..... جواب ایک دوسرے کی طرف پشت کیے دو مخالف  
راستوں پر آگے بڑھتے جا رہے تھے پھر اس نے کندھے  
اچکائے اور اطمینان سے سمو سے کھانے لگی۔

☆☆☆

”تو پھر تم لوگوں نے کیا سوچا ہے؟ جوائن کرو گے  
غزل کے منی اسکول کو؟“ وہ منال تھی جس نے سوال اٹھایا  
تھا۔ اس وقت گوکہ کورم پورا نہیں تھا مگر جو حاضر تھے وہ ان کی  
رائے جاننا چاہتی تھی۔

”میں تو جوائن کروں گا۔“ مانی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔  
”مانی اس سوسائٹی کے بھی کام ہوتے ہیں پھر اسٹڈی  
بھی ہے، مشکل ہو جائے گا۔“ سلمیٰ متاثر تھی۔

”بھئی وہ بھی تو کرتی ہے، جیسے وہ بیچ کرے گی، ہم بھی  
کر لیں گے۔ جتنا دماغ جتنی انرجی اس کے پاس اتنا دماغ  
اور اس سے کہیں زیادہ انرجی میرے پاس ہے..... جب وہ  
کر سکتی ہے تو دوائے ناٹ می۔“ مانی نے جواب دیا تھا۔  
”ٹھیک ہے لیکن میں ایک دو دن جا کر دیکھوں گی اگر  
ٹھیک سے کر سکی تو صحیح ورنہ نہیں کروں گی۔“ سلمیٰ مشروط طور  
پر راضی ہوئی تھی۔

”راحیلہ تم کیا سوچ رہی ہو؟“ خاموش بیٹھی راحیلہ،  
علی کو کچھ بھائی نہیں تھی۔

”میں سوچ رہی تھی کہ غزل کیا ہے؟ کیا وہ جو ہم اسے  
سمجھتے تھے یا وہ جواب ظاہر ہے۔“

”ہاں، واقعی وہ ویسی نہیں ہے جیسا اس کے بارے  
میں سنا گیا تھا۔“ مانی نے بھی اعتراف کیا۔

”میں بتاؤں وہ کیا ہے؟“ منال کے کہنے پر وہ سب  
اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”غزل آئینہ ہے..... اس میں سے آپ کو اپنا عکس ہی  
نظر آئے گا..... reflection ہے۔ جیسا بن کر آپ  
اسے ملیں گے اچھا برا، نارمل جیسا بھی وہ ویسے ہی reflect  
کرے گی۔“

مانی اس کے الفاظ پر حیران سے زیادہ بے یقین تھا۔  
”وہ صحیح کہتی ہے..... انتہا پسند وہ نہیں، تم ہو..... اس  
نے تو ابھی کسی کے لباس، کسی کے کام، کسی کے ملنے جلنے پر  
بات کی نہ اعتراض کیا..... یہ تم ہی ہو۔“

”now see how you are  
portraiting her“ وہ بولی۔

”مائے گاڈ..... چارون نہیں ہوئے اس کے ساتھ کام  
کرتے ہوئے اور تمہیں میں، میں غلط نظر آنے لگی۔“ غصے اور  
دکھ نے مل کر ٹینا کا منہ سرخ کر دیا تھا۔

”ٹینا تم غزل کا نام ہی کیوں لیتی ہو، میں نے تو  
راحیلہ، سلمیٰ اور منال کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔“

”ان کے ساتھ تو تم پہلے بھی کام کرتے ہی تھے لیکن  
یوں عائب نہیں ہوا کرتے تھے۔“ اور اس بات پر زارا نے  
تف کے سے انداز میں ٹینا کو دیکھا تھا۔ یہ ٹینا بھی ناں.....

”تمہاری بات کا سیدھا سا مطلب یہ ہی نکلتا ہے کہ یا  
تو میں غزل کے ساتھ افیئر چلا رہا ہوں یا پھر غزل میرے  
ساتھ اور ساری یونی چانتی ہے کہ وہ لڑکیوں تک کو گھاس نہیں  
ڈالتی..... لڑکے تو دور کی بات..... پھر بھی اگر تم ایسی بات کہو  
تو تمہاری عقل کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے میرے  
پاس تالیوں کے سوا کچھ نہیں۔“ وہ خاصا چڑ کر بولا تھا۔

”بائے داوے ٹینا، تم کیوں اتنی پوزیسیو ہو، رہی ہو وہ  
بھی مانی کے لیے؟“ وہ زارا تھی جس نے سیدھا سوال اس  
کے منہ پر مارا تھا۔

”کوئی کسی کے لیے کیوں پوزیسیو ہوتا ہے  
زارا.....؟“ ٹینا نے الٹا سوال داغ دیا تھا۔

”ہا..... ہائے.....“ زارا ہاتھ کی انگلیاں منہ پر رکھ کر  
پکی لاہورن بن گئی تھی۔

”تو کیا.....؟“ وہ ایک نظر مانی کو دیکھتی اور دوسری  
نظر سے ٹینا کو..... مانی نے تیز نظروں سے ٹینا کو دیکھا۔

”دوستی ہے..... تو اسے دوستی تک ہی رکھو ٹینا..... خواہ  
مخواہ کے جذبات پالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ سرد اور  
کھر درے لہجے میں کہہ کر وہ وہاں رکا نہیں تھا، چلا گیا تھا اور  
ٹینا..... اس کا منہ اتنا سرخ ہو گیا تھا لگتا تھا کہ ابھی پھٹ



## عنان گیر

حادثہ بن کر میرے وجود پر ٹوٹی ہے، میری حیرانی نہیں جاتی..... بے یقینی کو یقین راس نہیں آتا..... ہزار دفعہ سوال دہرا، دہرا کر بھی جواب سے دل ٹھہرتا نہیں، شکست مجھے منظور نہیں تھی اور ہار کبھی محبت نے نہیں مانی! تو پھر..... پھر کیا؟ کسی کو تو گھٹنے ٹیکنے ہی تھے ناں..... مجھ کو یا محبت کو..... کسی ایک تو ضرور ہی..... اور یہ بات لڑنے کے باوجود مجھے پہلے دن سے معلوم تھی کہ وہ کوئی ایک ”میں“ ہی ہوں۔

ہاں! وہ میں ہی ہوں لیکن یہ کہ میں اپنی طاقت آزماینا چاہتی ہوں..... سارا حوصلہ، سارا ضبط دیکھ لینا چاہتی ہوں..... جاننا چاہتی ہوں کہ میری قوت مجھے کہاں تک پیروں پر کھڑا رکھتی ہے۔ اور یہ بھی کہ عزت نفس کہاں تک سالم رہتی ہے..... کہاں تک میری گردن تن کر سیدھی کھڑی رہتی ہے اور کہاں اور کتنی دور تک میرے پیر سیدھی ہموار چال چلیں گے..... کہاں تک.....؟ آخر کہاں تک.....؟ ہاں میں یہ سب کچھ دیکھ لینا چاہتی ہوں، آزماینا چاہتی ہوں..... محبت ہوگی کوئی بڑی بلا لیکن جان لو کہ ”میں“ تم سے بھی زیادہ بڑی بلا ہوں..... ہو سکتا ہے گر جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ ہار مان لوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا ہونا مجھے ڈھادے لیکن اس کے باوجود..... اس سب کے باوجود میں تم کو خود پر قابو نہ پانے دوں گی..... چاہے تم مجھ میں حلوں کر جاؤ..... اور چاہے تم مجھے دیمک بن کر چاٹ جاؤ..... سال خوردہ کر دو..... مگر یہ طے ہے کہ میں تم سے بھی بڑی بلا ہوں..... میرے اشرف المخلوقات ہونے کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا..... تم بھی نہیں..... تو چلو آزما کر دیکھتے ہیں..... تو تمہارا جبر ٹھہرا اور میرا صبر..... تو چلو آزما کر دیکھتے ہیں..... کہ کب تک اور کہاں تک.....

☆☆☆

ان آٹھ میں سے چھ غزل کا ساتھ دینے پر راضی ہوئے تھے..... باقی انصر پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا سو چاہ کر بھی وہ اس کام کا حصہ نہیں بن سکا تھا اور سسٹمی اتنا لوڈ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ باقی رہ گئی راحیلہ تو علی تھا ناں..... جہاں علی ہو وہاں راحیلہ کیسے نہ ہو اور چاہے اس ”کیسے“ کو ممکن بنانے کے لیے اسے سر کے بل چل کر ہی کیوں نہ آنا پڑے..... سو یہ طے ٹھہرا تھا کہ جہاں علی، وہاں راحیلہ..... ان کی شفقت

”ٹھیک کہتی ہوں تم منال..... غزل واقعی میں آئینہ ہے۔“ اور تائید کرنے والا مانی تھا۔

☆☆☆

جب کبھی میں یہ سوچنے بیٹھوں کہ وہ مجھے کب اچھا لگا تھا یا پھر کب سے اچھا لگنا شروع ہوا تھا۔ کیا تب، جب اس نے مجھے دیکھایا پھر تب کہ جب میں نے اسے دیکھایا پھر شاید ہی جب ہم دونوں نے اک دوسرے کو دیکھا..... نہیں..... شاید تب جب وہ مسکرایا تھا۔ یا پھر شاید تب جب اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا تھا۔ اور یہ کب..... کا جو سراغ ہے ناں یہ مجھے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا..... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شروع سے ہی یہ احساس میرے ساتھ ہے ہمیشہ سے اور شاید ہمیشہ سے بھی پہلے کا..... اور یہ جو تعلق ہوتے ہیں ناں جو ہمیشہ سے بھی پہلے کے محسوس ہوتے ہیں..... یہ تعلق کم اور روگ زیادہ ہوتے ہیں۔ میں..... میں ہی کیوں.....؟ میرے ساتھ ہی کیوں؟ کیوں آخر..... کیا محبت کو اس بھرے عالم میں، میں ہی ملی تھی.....؟ یہ سانچہ میرے لیے ہی کیوں؟ میرے لیے زندگی بڑی آسان سی شے تھی۔ مانو سیدھی سڑک جیسی..... سبک رفتار سے چلتی ہوئی، پتا کسی روک، رکاوٹ کے..... مجھے لگتا تھا..... جیسے میں زندگی کو گزارنا چاہتی ہوں، سو میں ایسے ہی گزاروں گی جو میں چاہوں گی، وہ ہی ہوگا تو مجھ کو بھی عام لڑکیوں کی طرح اک دن گھر بسانا تھا، فیملی ہونی تھی اور اک پرسکون زندگی، بس..... لیکن، لیکن ہوا کیا؟ انہونی عجب طرح سے مجھ پر ڈھے پڑی..... اور اس انہونی نے مجھے بتلایا..... نہ بی بی نہ..... زندگی اس شے کا نام نہیں جسے تم سیدھی سڑک سمجھ کر گزارتی آئی ہو..... زندگی تو یہ ہے جو کہ اب تم پر ٹوٹی ہے اب اسے بسر کر کے دکھاؤ ذرا..... ہاں، محبت کا ہو جانا عجب امر نہیں ہے..... مگر محبت کا مجھے ہو جانا عجب امر ہے، میں نے تو یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی کسی کو چاہ نہیں سکتی ہوں..... کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جب نظر اسے دیکھے تو پھر اسے ہی دیکھنا چاہے..... میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ میں..... میں بھی کسی کو چاہ سکتی ہوں، یہ حادثہ مجھ پر بھی ٹوٹ سکتا ہے اور اس طرح سے بھی ٹوٹ سکتا ہے..... تو تب محبت عجیب سے بھی زیادہ عجیب محسوس ہوتی ہے کہ جب یہ



”تو پھر.....؟“

”انٹرنیٹ ٹیوٹوریلز.....“ جواب کندھے اچکا کر آ رہا تھا..... اور وہ سب اسے دیکھتے رہ گئے تھے..... آخر وہ کیوں اس طرح سے نہیں سوچتے تھے یا پھر کیوں اس طرح سے سوچ نہیں پاتے تھے۔ مانا کہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کی صلاحیت سب لوگوں کے پاس نہیں ہوتی ہے مگر پھر بھی ایسے افراد کی قلت نہیں مگر تصویر کا تیسرا رخ..... تیسرا زاویہ دیکھ لینا، بوجھ لینا..... یہ صلاحیت انہی افراد کے پاس ہوتی ہے کہ جن کی اس معاشرے میں قلت تھی..... غزل ”عام“ نہ تھی وہ کیا تھی؟ گراک پر ت کھلتی تو دوسری پر ت پر پھر سے یہ ہی سوال درج نظر آتا..... آخر وہ کیا تھی؟

اس نے بچوں کو زبانی میتھس کی کیلکولیشن کرنا سکھا دیا تھا۔ یہ دراصل ایک قسم کا abalus تھا اور بچے اس کے پوچھے جانے والے ریاضی کے سوالات کا جواب، ہاتھوں کی چند مخصوص حرکات سے ادا کرنے کے بعد زبانی دیتے تھے اور بالکل درست دیتے تھے۔ اس نے یوٹیوب پر ایک اسکول کے بچوں کو ایسے کرتے دیکھا تھا اور پھر بے حد مغز ماری، محنت اور ریسرچ کے بعد وہ اپنے بچوں کو ویسے ہی calculation کرنا سکھا پائی تھی اور جو بچوں پر محنت کرنا پڑی..... وہ الگ داستان تھی تو وہ ایک عام اسکول ضرور تھا مگر عام تعلیم تھی، نہ طریقہ وہ غزل مراد کا اسکول تھا۔

☆☆☆

حالیہ سسٹر کا رزلٹ بھی حسب توقع تھا۔ ٹینا، زارا اوسط درجے کی اسٹوڈنٹس سواب بھی رزلٹ یہ ہی بتایا تھا۔ یار اور حسن اوسط سے ذرا اعلیٰ درجے میں تھے، وہ اسی اعلیٰ درجے پر اب بھی فائز تھے..... راحیلہ، سلمیٰ، مناہل، انصر، قاسم اور جامعہ کے دوسرے بہت سے طالب علم بھی اپنی ذہانت کے مطابق ہی نتیجہ لائے تھے۔ رہ گیا مانی تو اس کی ٹاپ پوزیشن کو چیلنج کرنے والی بس ایک ہی تھی اور یہ ٹاپ پوزیشن یوں چیلنج نہ ہو سکتی تھی کہ اس ایک کا تعلق اسلامیات ڈیپارٹمنٹ سے تھا..... اور اس کا..... غزل مراد کا نتیجہ ہاں..... وہ حیران کن تھا..... ہمیشہ کی طرح وہ حیران کن ہی تھا لیکن اب... حیرانی کی نوعیت ذرا سی بدلی ہوئی تھی۔

”یہ..... یہ غزل مراد کا رزلٹ تھا؟ واقعی؟“

اس اہلی لگی تھی۔ اس طرح سے ایک ہفتے میں سب کی ایک بار ہا ری آئی تھی..... باقی غزل سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے پراسکول گھر کے صحن میں کھول رکھا تھا اور وہ لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے جس طرح وہ یونی میں حجاب میں ہوتی تھی بالکل اسی طرح سے حجاب میں لپٹی وہ گھر کے صحن میں بھی کھڑی تھی۔ مناہل کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا کہ اکثر کسی نہ کسی مسئلے یا معاملے کے سلسلے میں بچوں کے باپ آتے جاتے رہتے تھے گو کہ داد زیادہ انہیں ہینڈل کرتے تھے مگر پھر بھی... بحیثیت استاد اسے بھی ان کے سامنے جانا ہی پڑ جاتا تھا۔ سواب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا ناں کہ وہ یونی میں اور طرح کا پردہ کرے اور گھر میں کوئی نا محرم مرد آئے تو اس کے سامنے کسی اور طرح سے جائے.....

مناہل نے عجب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

تو اس کا اسکول، جو ذرا لڑکھڑا کر..... غیر متوازن طریقے سے ہچکولے کھا، کھا کر چل رہا تھا۔ اب ذرا متوازن اور سیدھی چال چلنا شروع ہو ہی گیا تھا۔ جتنے ان کے پاس وسائل تھے وہ بس اتنا ہی کر سکتے تھے کہ بچوں کو بنیادی تعلیم سے روشناس کروائیں۔ وہ بنیادی جمع تفریق کرنا سیکھ لیں..... IABC، ب اور جنرل نانچ کو تھوڑا بہت جان لیں..... اپنا نام لکھ سکیں اور اردو میں لکھا ہوا پڑھ سکیں..... وہ ان پر لگانا خواندہ کا ٹیگ ہٹا کر انہیں خواندہ افراد کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں ”سیکھنا“ سکھا دینا چاہتے تھے کہ مہذب دنیا میں خواندہ وہ نہیں تھا جو کہ لکھ، پڑھ سکتا ہے بلکہ خواندہ وہ تھا جو کہ یہ تین کام سرانجام دے سکتا تھا۔ learn, unlearn and relearn وہ گھر کے صحن میں انتہائی نامساعد حالات میں، نامکمل وسائل کے ساتھ اساتذہ کی کمی اور سیکنڈ چھوڑتھرڈ ہینڈ کتابوں کے ساتھ شروع کیے جانے والا اسکول ضرور تھا مگر وہ عام اسکول نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہاں ڈیلیور کی جانے والی تعلیم عام تھی..... اور نہ ہی وہ طریقہ کہ جس کے تحت وہاں تعلیم دی جا رہی تھی۔ اس ضمن میں غزل نے ان کی کچھ ٹریننگ کلاسز لیں تھیں اور جب انہوں نے حیرت بھری آنکھوں سے سوال کیا ”تم نے ٹیچرز ٹریننگ کورس کر رکھا ہے کیا؟“ تو اس سوال کا جواب ایک لفظی تھا۔

”نہیں.....“





### خوش خیالی

لوگ مجھ کو کتنا جلاتے رہے  
بے سبب مجھ کو کتنا ستاتے رہے  
میرے اندر قیامت سی برپا رہی  
ہونٹ پھر بھی میرے مسکراتے رہے  
(ان اللہ مع الصابرين)

کلام: افتخار شوق، میاں چنوں

ایسے ہو گئیں..... نہیں، نہیں آپ ایسے ”عام“ تو ہرگز نہیں  
ہو سکتیں..... آپ نمبروں پر ہی جچتی ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ.....  
”یہ لوگ بھی ناں.....“ اس نے سر جھٹکا اور خود کو راک  
نئے مرحلے کے لیے تیار کیا جو کہ اسے گھیر جا کر پیش آنا تھا کہ  
جن کے لیے ہمیشہ سے وہ خاص ہی رہی تھی۔

☆☆☆

کئی دن تو اس نے گھر میں ذکر ہی نہیں کیا تھا اور...  
عبد الحمید صاحب کو ہی خیال آیا تھا جب انہوں نے اسے لپ  
ٹاپ پر ہیڈ فون لگائے ایک دینی مسئلے کے بارے میں ویڈیو  
سننے دیکھا تھا۔

”غزل.....“ انہوں نے اس کا کندھا ہلا کر پکارا۔

سیر سیلی“ سب حیران، حیران ہو کر نوٹس بورڈ کو تکتے تھے اور  
تک کر پھر سے حیران ہوتے تھے۔ وہ ٹاپ پر نہ تھی۔ ٹاپ  
سے ذرا نیچے تھی..... دیکھنے والوں کو اس کو پہلے نمبر پر دیکھنے کی  
اتنی عادت ہو چکی تھی کہ کوئی دوسرا نام آنکھوں کو بے حد عجب  
محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چار میں سے چار جی پی اے اسکور کیا  
کرتی تھی ہر بار..... جی..... ہر بار مگر اب..... تو دیکھنے  
والوں کا حیران ہونا بنتا تھا اور حیران ہو کر پھر سے تکتا بھی بنتا  
تھا۔ کچھ کے دلوں کو بڑی راحت پہنچی تھی ٹھنڈک کا راک  
فرحت بخش احساس، کچھ بس حیران ہوئے اور کچھ وجہ پوچھنے  
اس کے پاس چلے آئے تھے۔

”آپ کا کیا..... رزلٹ رہا اس دفعہ.....؟“ پوچھنے  
والوں کو جواب کے بجائے راک سوال کا سامنا کرنا پڑا.....  
ارجال اس کو جواب دے دیا گیا۔

”اچھا تو لاسٹ سمسٹر میں کیا رزلٹ تھا؟“ راک اور سوال.....

”جی اتنا، اتنا تھا.....“ پھر سے جواب دے دیا گیا تھا۔

”تو جب آپ کا رزلٹ ایک سا نہیں رہا..... تو  
میں بھی ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور ضروری نہیں ہر دفعہ راک سا  
نتیجہ سامنے لاؤں اونچ، نیچ تو چلتی رہتی ہے ناں..... ہے  
ناں؟“ جواب کے بعد..... راک اور سوال تھا پوچھنے والوں  
کے لیے.....

”جی، جی بالکل.....“ تائیدی انداز میں سر ہلا کر وہ  
عجب نظروں سے غزل مراد کو دیکھتے ہوئے وہاں سے چلے  
گئے تھے..... تک چڑی، بد مزاج، مغرور، بد تمیز، فضول عورت  
جیسے القابات سے من ہی من میں نوازتے ہوئے اور جب وہ  
اس کی پہنچ سے دور ہو گئے تو پھر زبانی بھی بولتے تھے..... وہ  
تھک چکی تھی اس حیرانی، کوسہ، سہہ کر..... ہر پیریڈ میں، ہر  
استاد کو جواب دے، دے کر..... اس نے اب عام بنتا چاہا تو  
اندازہ ہوا..... عمومیت اس کے لیے نہ تھی اور جب وہ خاص  
تھی لوگ ہونہہ کر کے اسے ”عام“ گردانتے تھے اور اب جبکہ  
وہ عام سی ہو گئی تھی تو لوگ اس کے پاس پہنچ، پہنچ کر اسے  
بتاتے تھے کہ نہ بھی..... آپ کیسے ایسی ہو گئیں.....؟ ارے  
آپ تو یہ تھیں آپ تو وہ تھیں..... آپ کی ذہانت کے چرچے  
سے تو جامعہ بھری ہوئی ہے اور VC صاحب آپ کا تذکرہ ہر  
اسٹوڈنٹ میٹنگ میں کرتے رہتے ہیں۔ ارے آپ کیوں



”نی دادا.....“ اس نے ہینڈ فون اتار کر جواب دیا۔  
 ”اس سمسٹر کا رزلٹ ابھی تک نہیں آیا کیا؟“ اور اس  
 سوال پر بے اختیار اس نے اک گہری سانس بھری تھی۔ اس  
 نے ہاتھ پکڑ کر پاس کھڑے دادا کو صوفے پر بٹھایا پھر ویڈیو  
 بند کی، لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا، لیپ ٹاپ کو سائڈ ٹیبل پر  
 رکھتے ہوئے وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور دادا الگ اس  
 کی اس قسم کی کارروائیوں سے حیران ہو رہے تھے۔ سیدھا سا  
 سوال تھا، جواب بھی سیدھا ہی ہونا چاہیے تھا ناں..... بروہ کر  
 کیا رہی تھی، یہ بات تو خواب میں بھی سوچی نہیں جاسکتی تھی  
 کہ وہ انہیں اپنے رزلٹ سے آگاہ کرنے کی تیاری کر رہی تھی  
 کیونکہ ”غزل مراد“ کو کبھی ایسی تیاریوں یا تمہیدوں کا سامنا  
 نہیں کرنا پڑا تھا۔

”دادا! رزلٹ اس دفعہ اچھا نہیں آیا.....“ ہموار اور  
 متوازن لہجے میں اس نے سیدھی بات کی تھی۔

”فیل کیسے ہو سکتی ہو تم؟“ دادا حیران ہوئے۔

”فیل نہیں ہوئی۔“ وہ ہنس دی۔

”تو.....؟“

”تو یہ کہ اس دفعہ ٹاپ نہیں کر سکی۔“

”جی پی اے کتنا ہے؟“

”362.....“

”غزل.....!“ اور دادا کے غزل کہنے میں اک حیرت  
 نما تنبیہ تھی۔

”کوئی مسئلہ ہے، پریشانی ہے کوئی یا پھر اس دفعہ پیپر  
 مشکل تھے؟“ اس کا جھکا سر دیکھ کر انہوں نے پوچھا تھا۔

”نہیں..... کوئی مسئلہ نہیں، پریشانی نہیں پیپر بھی ٹھیک تھے۔“

”تو پھر تمہاری دلچسپی کم ہو گئی ہے کیا؟“

”ہاں..... یہ بات ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر اعتراف کیا۔

”کیوں؟ تمہارے تو بڑے خواب ہوا کرتے

تھے..... اعلیٰ سے اعلیٰ تر تعلیم کے۔“

”خواب اب بھی اپنی جگہ پر ہی ہیں دادا.....“

”تو پھر دلچسپی کیوں کم ہو گئی؟“

”میرا اسکول.....“ اور عبد الحمید اک لمحے کو بالکل

چپ سے ہو گئے تھے۔

”میں یہ نہیں کہتا کہ اسکول اہم نہیں..... مگر تمہاری

تعلیم بھی غیر اہم شے نہیں ہے جسے تم یوں نظر انداز کرو.....“  
 ”اچھا تو جو لوگ تعلیم کو نظر انداز کرتے ہیں وہ چوتھی  
 پوزیشن لیتے ہیں کیا؟“ وہ برامانے ہوئے بولی۔ دادا ہنس  
 دیے۔

”چوتھی پوزیشن والے یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ پہلی  
 پوزیشن بھی لایا کرتے تھے۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ کو  
 اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ اب میں دوبارہ کبھی یہ پوزیشن حاصل  
 نہ کر سکوں دادا..... مجھے اسکول کو کامیاب بنانا ہے۔ اس کے  
 لیے کوئی ایک چیز تو پس پشت جائے گی ہی ناں.....“

”اور وہ کون کہتا تھا مجھے اسلامیات ایک الگ انداز  
 سے پڑھانی ہے۔ اس طرح سے کہ میں طالب علموں کو  
 معاشرے کا فعال فرد بنا سکوں؟“ دادا کے لہجے میں ناراضی  
 تھی..... طنز تھا۔

”دادا اس میں تو ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ آنرز میں  
 چار سال لگتے ہیں..... میں تعلیم کو چھوڑنے کا تو نہیں کہہ  
 رہی..... ہاں..... میری پوزیشن پہ ضرور اثر ہوا ہے اور آگے  
 بھی ہوگا مگر میں فیل بھی تو نہیں ہوئی حتیٰ کہ اوسط درجے  
 میں بھی نہیں..... ذرا سا فرق ہی پڑا ہے ناں دادا..... یہ بھی تو  
 دیکھیں صرف نمبروں پوزیشن لانا زیادہ ضروری ہے یا ان  
 بچوں کا خواندہ ہونا.....؟“ دادا نے عجیب سے احساسات کا  
 شکار ہو کر اپنی پوتی کو دیکھا تھا۔ وہ اپنا کیرئیر، اپنا مستقبل داؤ  
 پر لگا رہی تھی..... محض ان بچوں کے لیے.....

”مگر تمہارا مستقبل.....؟“ وہ اتنا ہی کہہ سکے تھے۔

”میں چوتھے نمبر پر آ کر بھی اپنا مستقبل محفوظ کر سکتی ہوں

دادا..... مجھے ہر اک یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل جائے گا لیکن

ان بچوں کو کوئی غزل مراد نہیں ملے گی دادا..... کوئی نہیں.....

ان کے ہاتھ گریس سے لتھڑے رہیں گے، کسی ڈھابے کی

میزیں صاف کرتے رہیں گے۔ کوڑا، چختے رہیں گے یا پھر

کسی بھٹے پر اینٹیں محصوم ہاتھوں پر زخم لگاتی رہیں گی۔ مجھے

نہ روکیں..... پلیز مجھے کرنے دیں، میں بتا نہیں سکتی دادا مجھے

کیسا سکون ملتا ہے..... کیسی راحت ہوتی ہے جو اندر تک

اترتی ہے۔ یہ میرا صدقہ جاریہ ہے۔ اسے روکیں تو

مت.....“ لہجہ نرم سا ہو گیا تھا۔ کیسی بے قراری تھی جو اس کے لہجے



## مقام افسوس

☆ پہلے خون کے رشتے ہوتے تھے، افسوس  
اب رشتوں کے خون ہوتے ہیں۔

وجہ.....  
خود غرضی  
انا پرستی  
بے اعتمادی  
تنگ نظری  
اور بے حسی

مرسلہ: حسینہ ممتاز خان اسلام آباد

سے بھی زیادہ کی طاقت لگا رہی تھی اس اسکول کو کامیاب بنانے کے لیے..... امید کے کچھ ورکرز اب بھی اس کے ساتھ موجود تھے۔ جن میں منابل، راحیلہ اور مانی سرفہرست تھے۔ باقیوں کی حالت آن اور آف جیسی تھی۔ جب وقت ہوتا آجاتے اور جب مصروف ہوتے تو غائب..... دادا کو اعتراض نہیں تھا..... وہ اعتراض کر بھی کیسے سکتے تھے کہ وہ خود ایک سوشل ورکر تھے لیکن غزل کی حالت پریشان کن ہوتی جا رہی تھی ابھی کھانے کے دوران بھی وہ بچوں کی کاپیاں دیکھ رہی تھی۔

”غزل.....“ عبد الحمید نے پکارا تھا..... وہ اتنی مگن تھی کہ سیدھے ہاتھ میں نوالہ جوں کا توں پکڑ رکھا تھا۔ اور خود وہ اپنے سامنے موجود کاپی کے صفحات پلٹی جا رہی تھی۔

”غزل.....“ اب کہ اماں نے ناگوار سے لہجے میں سختی سے پکارا تھا۔

”جی.....“ وہ ہڑبڑائی۔

”دادا بلا رہے ہیں اور تمہیں ہوش ہی نہیں.....“ انہیں رہ کر تاؤ تھا۔

”سوری دادا..... جی کہیے.....“ وہ شرمندہ نظر آئی۔

”یہ کاپیاں اٹھاؤ.....“ حکم صادر ہوا۔

”دادا وہ میں.....“

”سنا نہیں.....؟ کاپیاں اٹھاؤ یہاں سے.....“

عبد الحمید کے بے لچک لہجے نے اسے مجبور کیا تھا اس نے کاپیاں اٹھا کر سائڈ پر رکھ دیں۔

سے چھلکتی تھی۔ دادا حیران تھے۔ اس نے ان کے خون سے کیا شے لے لی تھی کیا.....؟

”تم کیا ہو غزل.....؟“ سوال ہوا۔

”آپ کی پوتی..... جواب ترنت حاضر تھا۔

بے اختیار انہوں نے اس کا ماتھا چوما تھا۔

”یقین جانیں چوتھی پوزیشن والوں کو بھی جاب مل جاتی ہے۔“ ذرا شرارت سے وہ بولی تھی۔

”میرا بچہ.....“ انہوں نے ہنس کر اسے گلے سے لگایا تھا۔

یہ جو سوشل ورکر ہوتے ہیں ناں..... خدائی خدمتگار..... ان کے اندر اللہ نے عام انسانوں جیسی کوئی بھی چیز فٹ نہیں کر رکھی ہوتی..... دل نہ دماغ..... یہ ہم عام انسانوں جیسے نہیں ہوتے..... اگر یہ عام انسانوں جیسے ہوتے تو نہ عبد الستار ایدھی ہوتے اور نہ مدرثر سیا..... یہ انسانیت کی قطار میں کھڑے سب سے آگے لوگ.....

☆☆☆

اور پھر یوں ہوا کہ اس کی پوزیشن پھر کبھی دوبارہ نمبر 1 پر نہ جاسکی..... وہ دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں کے مابین ہی رہی مگر دوبارہ پھر کبھی نمبر 1 پر جانہ سکی..... اس کے ذہن سے جیسے یہ نکل گیا تھا۔ جیسے اسے اب اپنی پوزیشن سے فرق نہیں پڑتا تھا نہ ہی اس بات سے کہ وہ گولڈ میڈل نہ لے سکی تھی۔ اسکول اس کا جنون بنتا گیا..... وہ روز بروز ہرنے طلوع ہونے والے دن کے ساتھ اس میں کچتی چلی گئی..... ٹاک تک..... بعض اوقات وہ اپنے کھانے پینے کو بھی گول کر جاتی، اس کی... زندگی کے معمولات متاثر ہو رہے تھے..... تو ہوتے رہیں۔ وہاں پروا کسے تھی..... اماں اور... عبد الحمید صاحب یہ سب نوٹ کر رہے تھے مگر وہ چاہتے تھے کہ غزل خود ہی خیال کرے تو اچھا ہے..... انہیں ٹو کننا نہ پڑے تو یہ ہی بہتر ہے کہ وہ بچی تو نہیں تھی مگر وہ..... معلوم نہیں کون سی چیز..... اس میں سا گئی تھی جو وہ خود کو ہلکان کیے جا رہی تھی۔ وہ اپنی تعلیم کے حوالے سے بھی بے حد کانٹشس اور پرجوش ہوا کرتی مگر ایسا حال تو تب بھی نہیں ہوا تھا۔ اب کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ خود کو ختم ہی کر ڈالے گی اور یہ مثبت نہ تھا..... حد سے بڑھی چیز ٹپٹ کیسے کھلائی جاسکتی ہے۔ وہ خود کو مار رہی تھی، ختم کر رہی تھی..... اپنی پوری جان



”اور اب توجہ سے کھانا کھاؤ، تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کھا رہی ہو؟“ ان کے کہنے پر وہ چونکی..... ہاں، وہ کچھ کھا رہی تھی۔ ذائقہ بھی شناسا تھا مگر وہ تھا کیا؟ اس نے نظروں کا رخ فوراً پلیٹ کی طرف کیا تھا اور اسے تب احساس ہوا کہ اچھا وہ آلو قیمہ کھا رہی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر وہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”ہر چیز توجہ کی طالب ہوتی ہے غزل..... ہر چیز حتیٰ کہ آپ کا کھانا بھی..... تم اسے توجہ نہیں دو گی، یہ تمہیں اپنے ذائقے سے محروم کر دے گا۔ تمہارا پیٹ تو بھر جائے گا مگر لذت نہ رہے گی۔ سو توجہ سے کھایا کرو..... آئندہ میں تمہیں ڈائننگ ٹیبل پر کاپیوں کے ساتھ نہ دیکھوں.....“

”جی.....“ جھکے سر کے ساتھ ڈانٹ نما لیکچر سن کر اس نے کہا تھا۔

”دادا آپ نہیں سمجھ سکتے یہ کام میرے لیے کیا بن چکا ہے..... یہ اتنا اہم ہو چکا ہے کہ ہر چیز ہر دوسری شے پس پشت چلی گئی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ یہ بند کروں تو کسی کام کے لائق نہیں رہوں گی اور میں سوچتی ہوں گر میں یہ نہیں کروں گی تو کروں گی کیا.....؟ آخر کیا؟“

وہ کھانا کھا رہی تھی مگر ایک بار پھر سے ذائقے سے محروم ہو گئی تھی۔ تو پھر سے بھٹک چکی اور اب کہ وہ خود کو سوچوں کے بحر میں پاتی تھی۔

☆☆☆

اور خواہش، پیاس کا ختم ہے۔

اور پیاس..... یہ جینے نہیں دیتی..... مار ڈالتی ہے۔ میں، میں نہیں ہوں اب تو، ایک مشیت بھری خاک ہوں، ریت ہوں، صحرا ہوں، ہاں، محبت نے مجھے ڈھادیا، مار ڈالا..... میں تو سال خوردہ ہو چکی اب تو..... لیکن یہ کہ میں اس سے بڑی بلا ہوں..... اس محبت نے مجھے ختم تو کر ڈالا مگر یہ کبھی میرے پیروں کو سیدھی چال چلنے سے روک نہیں پائے گی۔ میری گردن تنی ہے اور میری انا سالم ہے۔ ہاں..... میں سال خوردہ ہو چکی، میں مٹ چکی، خاک ہو کر رہ گئی..... مگر یہ کہ میں محبت کو اتنی اجازت تو نہیں دوں گی کہ وہ میری راہ کھوٹی کر سکے اور چاہے یہ میرے وجود کو اٹھا، اٹھا کر زمین پر پٹختی ہی کیوں نہ رہے اور چاہے خواہش میرے اندر پیاس کا شجر ہی

کیوں نہیں اگا دے..... مگر یہ تو طے ہے محبت بڑی بلا نہیں ہے، وہ میں ہوں..... ہاں..... وہ میں ہوں..... میری جنگ ہے یہ اور ہارنے کے باوجود مجھے یہ لڑنی ہے تو جب یہ لڑائی کی حالت شدت پکڑتی ہے اور یہ شدت جب مجھے ادھ موا کرتی ہے تو تب ہاں تب میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک گناہ کروں..... محبت خواہش کو جنم دیتی ہے اور خواہش اس گناہ پر اکساتی ہے اور اکسا، اکسا کر بے حال کر چھوڑتی ہے۔ نوچتی ہے، کوڑے مارتی ہے، ریزہ، ریزہ کرتی ہے اور میرا جسم بھڑکنے لگتا ہے، بے چینی کسی اژدھے کے مانند میرے وجود کے گرد کستی چلی جاتی ہے اور میری ہڈیاں چٹختے لگتی ہیں، کہا جاتا ہے، کیا جاتا ہے گر میں ایک گناہ کر لوں تو..... روز اتنے لوگ..... اتنے سارے لوگ گناہ کرتے ہیں تو کیا ہے جو میں بھی ایک گناہ کر لوں تو..... پھر ساری عمر پڑی ہے معافی مانگنے کو..... سجدے کر کے داغِ ندامت کو مٹانے کو..... آنسو سے خود کو پاک کر لینے کو..... ساری عمر پڑی تو ہے..... تو کیا جاتا ہے گر میں ایک گناہ کر لوں تو..... مگر..... ہوتا کیا ہے..... ہر دفعہ جب میرے قدم اس گناہ کی سمت بڑھنے کے واسطے ہمکتے ہیں تو کوئی چیز..... کوئی ان دیکھی چیز..... کوئی احساس، کوئی نامعلوم سا احساس میرے پیروں کو باندھ چھوڑتا ہے..... روک دیتا ہے۔ اس سمت جانے نہیں دیتا..... مجھے روک لیتا ہے..... بے قابو نہیں ہونے دیتا..... تمام تر بے قرار یوں، تڑپنے اور جلنے کے باوجود کچھ ہے جو میرے قدموں کو باندھ دیتا ہے۔ اور چاہے کبھی میں خود کو اس گناہ کے لیے مائل نہیں کر پاتی اور..... اور اب میں ہوں..... میرا چٹخا وجود اور خواہش کا لقمہ و دق صحرا..... جہاں ابدی پیاس میرا مقدر ہے، میرے نصیب میں تو کوئی سراب بھی نہیں..... سراب جو جھوٹا ہی سہی، ہوتا تو تسلی بخش ہے..... تو میں وہ ہوں کہ جس کے نصیب میں سراب کی خوش فہمی بھی نہیں.....

☆☆☆

”سنو منا ہل.....!“

”ہاں، کیا ہے؟“

”یہ غزل نے تم لوگوں کے سامنے بھی کبھی حجاب نہیں

اتارا؟“ وہ اس سوال پر حیران ہوئی اور حیران ہو کر تاسم کو دیکھا۔



کورہ کر غصہ آیا تھا۔

”بچے تم میں تو کچھ بھی مانی جیسا نہیں۔“ سلٹی اندر آتے ہوئے بولی تھی۔ اس نے منابل کی بات سنی تھی اور چڑانے کے واسطے بولی تھی۔

”تم بھی.....“ قاسم کو شاک لگا۔

اور وہاں ایک قہقہہ گونجا تھا..... اور اس سارے میں غزل کا ذکر دب کر رہ گیا تھا..... تو جب وہ سارے قہقہے لگاتے تھے اور قاسم کو تنگ کرتے تھے تو مانی سوچتا تھا کہ غزل کیسی ہوگی..... بد صورت، خوب صورت، عام، معمولی سی کیسی؟ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسے کیوں سوچتا تھا۔ تجسس، انسانی فطرت، شاید مانی اسی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوچتا تھا۔

☆☆☆

چار سال..... چار سال گزر بھی گئے..... ہیں گزر بھی گئے.....؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وقت یوں اسے بٹا بتائے گزر بھی گیا تھا۔ وہ حیران تھی اور حیران سے زیادہ پریشان دکھتی تھی۔ اسے وقت کے یوں چپ چاپ، کچھ کہے بٹا گزر جانے پر شکایت تھی..... اور شکایت بڑی سخت تھی آج آخری دن تھا جامعہ میں..... اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ نوکل گلاسز کے پیچھے موجود آنکھوں اور نقاب میں چھپے چہرے پر آنسو روانی سے بہتے تھے اور وہ کسی بھنگی ہوئی روح کے مانند پوری جامعہ میں پھرتی تھی۔ لائبریری، لان، کلاس رومز کہاں، کہاں نہیں گئی تھی وہ۔ ہر چیز کو ہاتھوں سے چھو کر محسوس کرتی یوں جیسے اس کا لمس انگلیوں کی پوروں پر محفوظ کر لینا چاہتی ہو..... بھولنا نہ چاہتی ہو..... وہ اس روم میں بھی گئی کہ جہاں دروازے میں مانی کھڑے ہو کر منہ کھول کر اسے دیکھتا تھا، وہ اسی کرسی پر بیٹھی تھی اور کوئی دھڑام سے گرنے کی آواز نہ تھی اور نہ ہی اب کوئی منہ کھول کر اسے دیکھتا تھا، کوئی قہقہہ بھی نہ تھا آنسوؤں میں شدت آئی اور وہ حیران ہوئی..... اتنی جذباتی تو وہ کبھی نہیں رہی تھی۔ اب..... اب کیا ہوا تھا؟ اسے تو جامعہ آنا اچھا نہیں لگتا تھا کہ یہاں لوگ اسے عجیب، عجیب نظروں سے دیکھتے تھے یوں جیسے اس کے عبا یا کو اتار دینا چاہتے ہوں تو اب..... اب کیا ہو گیا تھا اور یہ جو ”کیا“ تھا ناں اس کا سراغ نہ ملتا تھا۔

”کیوں.....؟ تم کیوں پوچھتے ہو؟“

”ویسے ہی..... پتا تو چلے آخر ہے کیسی وہ.....؟“

”جیسی بھی ہے..... ہمیں کیا؟“ منابل نے کندھے اچکائے۔

”تو، واقعی ہی اس نے کبھی تم لوگوں کے سامنے بھی حجاب نہیں اتارا.....؟“ اور اب یہ پوچھنے والا مانی تھا، لہجے میں تجسس زور مارتا تھا۔

”نہیں مانی..... کبھی دھیان ہی نہیں گیا..... بس اپنی کلاس لی اور واپس..... اتنا وقت ہی نہیں ہوتا۔“ منابل نے کہا۔

”کبھی ہاتھ بھی نہیں دیکھے کیا؟“ مانی کو معلوم نہیں کس بات کا تجسس تھا۔

”نہیں.....“ جواب یک لفظی تھا۔

”ویسے وہ خود کو کیوں اس طرح سے چھپا کر رکھتی ہے۔ سمجھ سے بالاتر ہے، اگر خوب صورت ہوتی تو یوں خود کو چھپا کر نہ رکھتی کہ خوب صورت لوگوں کو خود کو نمایاں کرنے کا شوق ہوتا ہے، یقیناً وہ خوب صورت نہیں ہے بلکہ بد صورت ہوگی جیسی تو.....“ اور یہ مانی کا تجزیہ تھا۔

”ہو سکتا ہے وہ اس اسکول آف تھاٹ سے ہو جو کہ عورت کو ہاتھ، پیر کھولنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔“ منابل نے جیسے مانی کے تجزیے سے انکار کیا تھا۔

”یہ بھی ممکن ہے لیکن پھر بھی، کبھی کسی کو یوں تو نہیں دیکھا۔“ مانی نے تائید کرنے کے باوجود انکار کیا تھا۔

”دلیل..... وہ جو بھی ہے ہمیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“ منابل کے کہنے پر مانی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

”مطلب تو ہوتا ہے ناں پھر..... کیوں مانی.....؟“ اتنا کہہ کر قاسم اور مانی ہاتھ پر ہاتھ مار کر بنے تھے۔

”وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور تم لوگوں کو زیب نہیں دیتا کہ اس کے بارے میں یوں بات کرو.....“ منابل کو برا لگا۔

”ہاں..... اچھی تو وہ ہے۔“ مانی نے اعتراف کیا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے مانی.....؟ تم تو ایسے نہیں تھے، قاسم یا کوئی اور ایسی بات کہے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن تم.....“ منابل کے چہرے پر افسوس کے سے تاثرات تھے۔

”کیوں، مانی میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔“ قاسم



”مجھ اسی دن آ رہا تھا کہ اسے ”کیا“ ہو گیا تھا۔ انسانی فطرت میں یہ مانوس ہو جانا اور انس میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں چاہیے انسان ہو، جانور ہو یا پھر اینٹ۔ یہ سنی کوئی جامعہ ہی کیوں نہ ہو۔ تو چار سال سے یہ وہ اپنی نہیں سمجھتی تھی وہ آج..... یوں اچانک، اپنی ہو گئی تھی اور اپنی اس اپنی کے پرانے ہونے کے غم سے آنکھ خشک نہ ہوتی..... جب دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو اس نے واپس جانا چاہا اور جب واپس جانا چاہا تو یک دم امید کا خیال آیا تھا۔ ان لوگوں نے کتنا ساتھ دیا تھا اس کا..... دیوار مہربانی سے لے کر اس کے اسکول تک..... وہ کیسے اللہ حافظ کہے پتا چلی جائے..... اتنی بے مروت تو وہ نہیں تھی۔

تو جب وہ ”امید“ کے آفس پہنچی تو وہاں صرف لڑکیاں ہی موجود تھیں۔ لڑکے سب غائب تھے..... منال آج خاص طور پر سفید دوپٹا اوڑھ کر آئی تھی جواب رنگین ہو چکا تھا..... وہ دوپٹے کے پلوؤں پر سب سے آٹو گراف لے رہی تھی..... اس نے پلو غزل کے آگے بھی کیا تھا۔ غزل نے اپنا نام لکھ دیا۔ وہ جانے لگی تو انہوں نے اسے روک لیا۔

”ایسے کیسے جانے دیں..... ابھی سب آتے ہیں تو پارٹی ہوگی کچھ کھاپی کر ہی جانا.....“ راحیلہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر زبردستی بٹھایا تھا۔

”آپ کا شکریہ مگر آپ جانتے تو ہیں میں ایسی کسی گید رنگ کا حصہ نہیں بنتی.....“ اس نے شائستگی سے معذرت کی تھی۔

”اچھا ابھی نہ حصہ بننا ہماری گید رنگ کا کم از کم مانی لوگوں کو گڈ بائے ہی کہتی جاؤ.....“ سلمیٰ نے جیسے اس کا راستہ روکا تھا۔ اور وہ رک بھی گئی تھی۔ اتنا تو بنتا ہی تھا کہ وہ ان لوگوں کو گڈ بائے کہہ دے..... وہ منال کی طرف منہ کیے اس سے ہاتھیں کر رہی تھی کہ جب اسے اپنے پیچھے ایک بے ہنگم شور سنائی دیا۔ ساتھ ہی اوئے غزل..... ایک سرگوشی کی سی آواز اور اس کے ساتھ ہی جیسے کسی نے شور کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اور پھر چند قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔

وہ ایک، ایک کر کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”السلام علیکم!“ اور ایک، ایک کر کے سب تمیز سے

اسے سلام کرتے نشستیں سنبھال چکے تھے۔

”غزل ہم کو لوگوں کو اللہ حافظ کہنے آئی تھی“

منال نے اعلان کیا تھا۔ ایک لمحے کو وہاں ایسی خاموشی پھیل جیسے کوئی بھی نہ سمجھ پایا ہو کہ اب کیا کہے، غزل نے اپنا کچھوڑی اور کھڑے ہوتے ہوئے ان سب پر ایک نظر ڈالا تھی۔ مانی بھی آج سفید شرٹ پہن کر آیا تھا اور..... شرٹ کی سفیدی بھی رنگین ہو چکی تھی۔ کہیں پر رنگ، گاتھ کے پنجوں کے نشان تھے، کہیں پر quotes..... کوئی شعر اور کہیں سلیکچرز.....

”آپ سب لوگوں کا بہت، بہت شکریہ اس لمحہ کے لیے کہ اس مدد کے لیے جو آپ نے out of the way جا کر میرے لیے کی..... میں بدلہ نہیں دے سکتی..... بلکہ دینے والی شے ہی نہیں..... میں دعا کر سکتی ہوں آپ کی خوشیوں کی اور کامیابیوں کی اور آپ لوگ یہ دعاؤں کا حصہ رہیں گے۔ زندگی میں کبھی، کسی بھی طرح میں آپ لوگوں کے کام آسکوں تو میرے لیے اس..... کر چیز اور کوئی نہ ہوگی..... بہت شکریہ..... اللہ حافظ..... ہمارا آواز میں کہہ کر وہ رکی نہیں تھی..... باہر نکلنے لے رہی تھی.....

”تم نے تو زلا ہی دیا.....“ منال سوں، سوں..... ایک دم اس کے گلے آگئی تھی۔ اس طرح سے کہ وہ کھل میں نہ پائی تھی۔ اس نے غزل کے نقاب والے چہرے، اس ہانسی پٹاخ بو سے لیے تھے..... اور منال پہلا قطرہ ثابت ہوئی اس کے بعد راحیلہ اور سلمیٰ نے بھی اسے یوں ہی ملی تھیں۔

”غزل.....“ مانی نے پکارا تھا۔ وہ ایک لمحے لپکتی اور پھر مانی کی طرف مڑی۔

”جی.....“

”آپ مجھے آٹو گراف دیں گی پلیز.....“ وہ اپنا کیپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔ وہ اب..... تذبذب کا شکار ہوئی اور پھر پی کیپ اس کے ہاتھ..... لکھنے لگی تھی۔

”Thank you Usaman shahid“

اس نے تیزی سے لکھا اور پی کیپ اسے واپس کی تھی

”شکریہ کیوں کہہ رہی ہیں ہار، ہار.....“ اعتراض ہوا۔



## عنان گیر

رہی..... وہاں قہقہے تھے، شور تھا اور زندگی اپنے جو بن پر تھی۔

☆☆☆

میرادل چاہتا ہے کہ میں ساری دنیا بن جاؤں..... فقط میں ساری دنیا بن جاؤں..... میرے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے..... سننے پہ آئے تو میرے علاوہ کچھ سنائی نہ دے..... بولے تو فقط میرا نام بولے..... میں یوں، اس پر عیاں ہو جاؤں کہ اسے باقی ہر شے دکھائی دینا بند ہو جائے اور وہ جان لے کہ میں ہی تو اس کی ساری دنیا تھی۔ فقط میں ہی تو..... جب وہ کسی لڑکی کے پاس کھڑا ہوتا ہے، ہنس کر بات کرتا ہے، اسے اپنی نظروں سے دیکھتا ہے تو اس پل، ٹھیک اسی پل میرادل کہتا ہے کہ جاؤ اور جا کر پوری دنیا بن کر اس کی آنکھوں میں اتر جاؤ..... اس پر حاوی ہو جاؤ، اسے کسی اور کا نہ چھوڑو..... اتنا تو مجھے یقین ہے کہ گر میں اس کے سامنے اعتراض کروں، ڈٹ کر کھڑی ہو جاؤں تو کسی اور عورت کا وہاں کیا کام؟ وہ اس قابل کب رہے گا کہ کسی اور طرف نگاہ کر سکے، دیکھ سکے..... وہ میری طرف دیکھنا چاہے گا اور بار، بار دیکھنا چاہے گا..... ہاں میں ایسا ہی حسن ہوں..... چاند کا غرور کیا ہے؟ کیا یہ کہ وہ بہت حسین ہے؟ نہیں غرور تو یہ ہے کہ اتنے وسیع آسمان پر وہ اکیلا ایسا حسین ہے کہ جسے ساری دنیا گردنیں اٹھا، اٹھا کر دیکھتی ہے..... تو میں بھی ایسا ہی حسن ہوں..... جولب بام پر آؤں تو دنیا کی گردنوں کو جھکانہ رہنے دوں..... آنکھوں میں تحیر بھر دوں اور لبوں کو گونگا کر چھوڑ دوں..... چکور تب چاند کی طرف نہ اڑیں، وہ میری طرف اڑان بھریں اور پھر بے مراد ہو کر گر پڑیں..... ہاں میں ایسا ہی حسن ہوں..... تو تب..... تب وہ کیسے نہ مائل ہوگا..... کیسے نہ.....؟ حسن سے آگاہی فتنہ ہے اور میرادل چاہتا ہے کہ یہ فتنہ اس پر ٹوٹ پڑے۔ حسن سب سے بڑا عامل..... کوئی پُراثر تعویذ..... اس سا کوئی دوجا نہیں باندھ کر رکھ چھوڑے اور کہیں جانے نہ دیوے..... کسی کام کا نہ چھوڑے..... بس ایک جھلک اور کام تمام..... تو محبت خواہش جگاتی ہے اور خواہشیں تو مومن کو بہکاتی ہے۔ زور لگاتی ہے اور منہ کے بل گرا دینے کو بے تاب ہے لیکن..... میرا وقار سلامت ہے اور میں پورے قد سے کھڑی ہوں۔

دل کا کیا ہے اس کا تو کام ہی خواہش کو سینچنا ہے اور

”اس لیے کہ یہ بار، بار کہے جانے کے لائق چیز ہے۔“ اعتراض چٹکیوں میں اڑا دیا گیا۔

”میں نے اپنی مرضی سے ہی کیا..... جو بھی کیا.....“

”اور آپ کی مرضی میرے کہے جانے کے تابع تھی.....“ اور اب کہ وہ لا جواب ہوا تھا اور وہ یوں لا جواب کیے جانے پر مسکرایا۔

”ایک اچھی اور کامیاب زندگی آپ کا نصیب ہو اور میں آؤں گا دوبارہ..... اسی یونی میں یہ دیکھنے کہ سلامیات کیسے پڑھائی جا رہی ہے.....“ غزل کی آنکھوں میں ایک دم استعجاب ہوتا اجازت اتر اور اس نے مانی کو دیکھا..... بلا ارادہ ہی..... وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ غزل نے سیکنڈ سے بھی پہلے نظریں جھکائی تھیں۔ تو اب بھی اسے یاد رہا تھا۔

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہو.....“ اس نے مدھم لہجے میں کہا اور اللہ حافظ کہتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

”چار سال ہو گئے مگر اس لڑکی کا چہرہ نہ دیکھ سکے.....“ قاسم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”چہرہ.....؟ اس نے تو پیر تک کو اجازت نہیں دی کہ کسی کی نگاہ کی زینت بنے.....“ یہ مانی تھا۔

”راحیلہ کے بعد میں جس کو ساری عمر یاد رکھنے والا ہوں..... وہ غزل ہے.....“ اور اب یہ علی تھا۔ اور سب نے علی کے کہے جانے والے جملے کو عام جملہ سمجھا تھا۔

سمجھ تو تب آیا جب ”ہائے اللہ“ کہہ کر راحیلہ نے شرماتے ہوئے دوپٹے کا پلو سر پر ڈالا تھا اور پھر اس پر بس نہ کیا تھا۔ پلو کو ماتھے تک کھینچ بھی لیا تھا۔ وہ شرم سے سرخ ہو جانا چاہ رہی تھی مگر سرخی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی کہ چہرے پر جھلک دکھاتی ہی نہیں تھی۔ یہ علی کا برملا اعتراف تھا جو آج سے پہلے تک نہیں ہوا تھا۔ اور اب وہاں ہنگامہ تھا، شور تھا، کولڈ ڈرنک کی بوتلوں کو اچھی طرح سے شیک کرنے کے بعد ڈھکن کھولے جا رہے تھے..... مشروب اٹل رہا تھا اور وہ ایک دوسرے پر ابلتا مشروب پھینک رہے تھے..... راحیلہ شرمائے ہی چلی جا رہی تھی۔ اور منال کو اس کی شرمناہٹ تمللانے پر مجبور کرنی تھی اور وہ کہیاں مار، مار کر اسے پراسرود کرنے کا کہتی تھی کہ وہ اور سلٹی ہی اس کام میں مدد دیتیں اور راحیلہ سنتی نہ تھی اور بس شرم کو خود پر طاری کیے بیٹھی



سب نوا میں حلال تو نہیں ہوتیں کچھ گناہ بھی کہلاتی ہیں۔  
ان کی کوئی دوسری ترجیح پیش کی جاسکتی ہے نہ ہی کوئی دلیل  
گناہ، گناہ ہوتا ہے اور بس..... بس..... یہ میرا عذاب ہے  
اور اسے مجھے ہی جھیلنا ہے۔

☆☆☆

”مراد فاؤنڈیشن.....“ عمارت کے اوپر جلی حروف  
میں لکھا تھا۔ اور یہ غزل جانتی تھی کہ وہ گھر کے صحن سے عمارت  
اور عمارت کے ماتھے پر لکھے گئے ان جلی حروف تک کیسے پہنچی  
تھی۔ وہ پی ایچ ڈی نہیں کر سکی تھی۔ وہ اپنی تعلیم کا کوئی بھی  
سلسلہ برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ اس کے سب خواب جیسے ”مراد  
فاؤنڈیشن“ کے قیام میں مدغم ہو چکے تھے۔ کامیابی بس یہ ہی  
تھی کہ اسے ایک منفرد، اعلیٰ بین الاقوامی معیار کا ایسا اسکول  
بنانا تھا کہ جہاں امرا کی اولادیں نہیں، غربا کے بچے معیاری  
تعلیم حاصل کر سکیں..... اور اس کے جنون نے یہ کر دکھایا تھا۔  
چھ سال لگے تھے..... چھ سال مگر یہ ہو گیا تھا۔ اس نے کر دکھایا  
تھا۔ امید کے در کر کچھ عرصے تک ساتھ رہے اور پھر آہستہ  
آہستہ سب چھوڑتے چلے گئے۔ کسی کی شادی ہو گئی، کوئی  
جاب کی مصروفیات میں گم ہو گیا اور مانی وہ تو تھا ہی  
پر دینی..... تعلیم مکمل کر کے اسلام آباد لوٹ گیا تھا جو کہیں  
نہیں گئی تھی تو وہ غزل تھی۔ اچھا خاصا اسکالر شپ پی ایڈمیشن ملا  
تھا اسے اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی میں..... اس کے لیے  
اسے ہاسٹل نرڈ ہونا پڑتا اور گریسا ہوتا تو آج مراد فاؤنڈیشن  
ہوتا، نہ اس کی عمارت ہوتی اور نہ ہی عمارت کے اوپر لکھے گئے  
وہ جلی حروف ہوتے۔ تو بس اس نے فیصلہ کیا اور ڈٹ گئی اور  
آج اس کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ ملک کے معروف انگریزی اخبار  
کے سنڈے میگزین میں اس کا انٹرویو چھپا تھا۔ ساتھ  
میں تصاویر بھی تھیں۔ ویسی ہی سیاہ عبا یا میں..... ڈھکے ہاتھ  
اور بیروں کے ساتھ..... اس کی جدوجہد کی داستان تھی۔ سر توڑ  
کوشش کی کہانی..... جیسے چھ سال کے بعد کسی اخبار کا ورق  
اُٹا ہوا تھا۔ فنڈز کی اب بھی قلت تھی۔ بین الاقوامی معیار  
کا ماحول آسان تو نہیں تھا ایسے میں جبکہ اسکول میں غربا کے  
بچے نہ مٹتے ہوں تو اس نے فنڈز کے لیے اپیل بھی کی تھی اپنے  
..... میں گو کہ عبد الحمید کا حوالہ بھی تھا۔ اس کے لیے مگر  
..... نامی گرامی شخصیت نہیں تھے۔ ان کی شہرت بس

اپنے علاقے تک تھی۔ غزل کو وسیع پیمانے پر مدد چاہیے تھی۔  
اس نے بطور خاص سرکار سے مدد کی اپیل کی تھی اور اتفاق  
دیکھیے کہ سرکار کا ہی ایک بندہ اس وقت اس کا انٹرویو پڑھ رہا  
تھا۔ اور آج بھی..... آج بھی غزل مراد نے اسے اسی طرح  
سے حیران کیا تھا کہ جس طرح سے وہ جامعہ میں کرتی رہی  
تھی..... وہ مسکرائے بننا نہیں رہ سکا تھا۔

”تو آج بھی تم کسی اسرار کے مانند ہی ہو غزل  
مراد..... سیاہ ریشم میں لپٹی..... تم کیا ہو.....؟ کیا کوئی متبرک  
شے ہو؟ بھلا بتاؤ تو سہی تم کیا ہو؟ کیا؟“ وہ غزل کی سیاہ لباس  
میں موجود تصویر کو دیکھتا کم اور سوچتا زیادہ تھا۔

☆☆☆

اس کے سامنے ایک وزیٹنگ کارڈ لا کر رکھا گیا تھا.....  
غزل نے ٹیبل کی سطح سے دو انگلیوں کی مدد سے کارڈ اٹھایا اور  
نام پڑھا۔

”قاسم محمد.....!“ اور پھر دماغ پر بہت زور دینے کے  
باوجود اسے یاد نہیں آیا تھا۔

”میں تو ان صاحب کو نہیں جانتی سر کے کمرے میں  
بھجوانا تھا ان کو.....“ اس نے ملازمہ سے کہا تھا۔

”جی دیں پر بھیجا تھا.....“ سر نے یہ کارڈ آپ کو دینے کا  
کہا ہے۔“ ملازمہ کے جواب پر وہ ابھی تھی۔ اس نے انٹرکام  
اٹھا کر دادا کے کمرے کا نمبر ملا یا تھا۔

”آپ نے یہ کارڈ مجھے کیوں بھیجا؟ کیا پھر سے کسی  
امیر آدمی کی سفارش آئی ہے؟“

”ہاں..... آدمی تو امیر ہی ہے۔“ دادا نے سامنے  
بیٹھے شخص کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ غزل کے پاس آئے روز  
ایڈمیشنز کے حوالے سے سفارشات آتی رہتی تھیں۔

”اور آپ نے پھر بھی میرے پاس یہ کارڈ بھیجا.....“  
وہ ناراضی بھرے لہجے میں بولی تھی۔

”تو تم نے بالکل نہیں پہچانا.....“ اب کہ دادا نے کہا۔

”نہیں.....“ وہ ابھی اور ایک بار پھر سے کارڈ کو دیکھا تھا۔

”قاسم..... قاسم..... ارے یہ امید والا قاسم تو نہیں

دادا.....؟“ اسے جیسے اک جھماکے کے ساتھ یاد آیا تھا۔ دادا  
ہنس دیے۔

”ہاں..... وہ ہی ہے..... تمہارا انٹرویو پڑھ کر ملنے چلا



## عنان گیر

یوں دی گئی تھی جیسے کہتے ہوں..... آج بھنڈی پکی ہے۔ اور وہ اتنی حیران کہ مارے حیرت کے اک پراثر سا ”کیا“ بھی نہ کہہ پائی تھی۔ وہ بس ٹکڑ، ٹکڑ دادا کی شکل دیکھ رہی تھی۔ یوں گھورے جانے پر دادا بد مزہ ہوئے تھے اور تڑپ کر اسے دیکھا۔

”شرم تو نہیں آتی دادا کو یوں آنکھیں پھاڑ کر گھورتے ہوئے۔“

”اور آپ کو بھی نہیں آتی یوں اپنے.....“

”غزل.....“ وہ تنک کر بول رہی تھی کہ اماں کی تنبیہی

پکارنے منہ بند کروادیا تھا۔

”اب قاسم میں کیا برائی ہے؟“

”کوئی بھی تو نہیں.....“

”تو پھر ارادے تو تمہارے نیک نظر نہیں

آ رہے.....“ دادا خفگی سے بولے۔

”دادا..... وہ سرکار کا ملازم ہے۔ آج ادھر پوسٹڈ

ہے تو کل کہیں اور..... اور میں اپنے اسکول کو پیک کر کے اس

کے ساتھ شہر، شہر نہیں گھوم سکتی۔ کچھ تو خیال کریں۔“ وہ

رونے والی ہو گئی تھی۔ اس کے یوں کہنے پر سر اور بہونے

ایک دوسرے کو دیکھا۔ کہتی تو غلط نہیں تھی لیکن پروپوزل بے حد

... اچھا تھا۔

☆☆☆

وہ آج ہی ادھر تعینات ہوا تھا اور تعیناتی کے تھوڑی دیر

بعد ہی اس کا رخ اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی طرف تھا۔

اسے ہنسی آئی..... بے وقوفی سے کچھ بڑھ کر اسے یہ

حرکت محسوس ہوئی۔ وہ ایک لڑکی کو دیکھنے آیا تھا۔ وہ بھی کس

قدر اشتیاق سے..... اس کا جی چاہا کہ دل کھول کر قہقہہ

لگائے، وہ زیر لب مسکراتا ہوا دونوں ہاتھ پنٹ کی جیبوں

میں ڈالتا ہوا اسی کا ریڈور سے گزرا تھا..... لیکن اب، اب

وہاں کوئی ایسی نقاب پوش لڑکی نہ تھی جو عام سادہ سی نگاہوں

سے اسے دیکھتی اور اس کے پہلو سے ہو کر گزر جاتی وہاں اس

کمرے میں کوئی کلاس ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے ٹھہرا رہا یوں

جیسے کچھ سمجھ نہ پایا ہو۔

”سنو بیٹا.....“ اس نے پاس سے گزرتی لڑکی کو روکا۔

”جی.....؟“

”مس.....“ وہ ایک دم رکا..... معلوم نہیں ابھی تک

وہ مس تھی یا مسز.....

آیا ہے۔ اسی شہر میں پوسٹڈ ہے..... بندہ کام کا ہے غزل.....

planning and budget ڈیپارٹمنٹ

میں ہوتا ہے۔“ دادا کے یوں کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔

”آتی ہوں.....“ ہنستے ہوئے کہہ کر اس نے ریسیور

کریڈل پر ڈالا تھا اور قاسم سے ملنے کے لیے اٹھی

تھی..... باہر سے اسکول کو دیکھیں تو اک عمارت ہی نظر آتا

تھا لیکن اندر سے اسکول کے دو حصے تھے ایک بیرونی حصہ جو

کہ اسکول کا ایڈمن ڈیپارٹمنٹ تھا اور وہیں کے معاملات کو

عبدالحمید ہینڈل کیا کرتے تھے اور ایک اندرونی حصہ جس

کے مین گیٹ کے پار پرائمری اسکول کی عمارت تھی۔ غزل کا

رخ اب اسی بیرونی حصے کی جانب تھا۔

☆☆☆

”تمہیں اب شادی کر لینی چاہیے غزل.....!“ دن

میں اگر یہ ذکر نہ ہو تو غزل کو بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ اب

بھی رات کے کھانے پر ہزار دفعہ کہی جانے والی بات دہرائی

گئی تھی۔

”میں نے کب انکار کیا ہے دادا.....“ وہ زچ نظر آئی۔

”اقرار بھی تو نہیں کرتی ہو.....“ دادا ناراض نظر آئے۔

”اتنی محنت کر کے اتنی جان مار کر عمر کے بہترین سال

اسے عنایت کر کے اب میں اسکول کو محض گھر بسانے کے

لیے چھوڑ دوں..... آپ سمجھتے کیوں نہیں؟“ اب کے وہ بے

بس نظر آئی۔

”تو کہاں سے لاؤں ایسا آدمی ڈھونڈ کر جو تمہارے

اسکول کو بھی سپورٹ کرے.....“ دادا اس سے زیادہ مجبور

دکھتے تھے۔

”ہوگا..... کہیں نہ کہیں تو ہوگا ہی.....“ وہ بے

پروا ہوئی۔

”کیسے ہوگا.....؟ ڈھونڈیں گے تو ہوگا ناں.....

ایسے بیٹھے بٹھائے تو ہونے سے رہا.....“ اب یہ اس کی اماں

تھیں جو بے حد تپے ہوئے انداز میں بولی تھیں۔

”میں نے ڈھونڈنے سے منع تو نہیں کر رکھا۔“ ان

کے غصے سے خائف ہوتے ہوئے وہ بولی تھی۔ اماں منہ ہی

منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔

”قاسم کا پروپوزل آیا ہے تمہارے لیے۔“ یہ اطلاع



”جی سر.....!“ لڑکی نے اس کے رکنے پر کہا تھا۔  
”مس غزل مراد پڑھاتی ہیں آپ کو.....؟“ اس  
والہ لڑکی نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔  
”نو سر..... ہمیں تو کوئی غزل مراد نہیں  
ہاں حالتیں.....“ اور وہ یہ انکار سن کر حیران ہوا، ایسا کیسے ہو سکتا  
تھا ہمارا؟ اس کو تو یہ ہی کرنا تھا..... ہمیں آنا تھا تو پھر.....؟  
اسے توقع نہ تھی کہ غزل مراد اسے ڈیپارٹمنٹ میں  
لوں ملے گی۔ یہ عجب بات تو نہیں تھی لیکن مانی کو بے حد  
پسند ہوئی تھی۔ غزل کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔  
اور اب جب وہ یہاں نہیں تھی تو وہ کہاں ہوگی؟ کیا  
رہتی ہوگی؟ کسی گھر میں اپنے بچے سنبھالتی ہوگی؟ کسی مرد کی  
مست کرتی ہوگی؟ کیا اب بھی وہ ویسے ہی نقاب کرتی  
ہوگی..... ویسے ہی کیا؟ مانی سوچتا تھا۔ وہ کسی جذبے سے  
مطلب ہو کر نہ آیا تھا۔ وہ تو بس یادیں دہرانے آیا تھا۔ یہ  
یہی وہ آیا تھا کہ اب اسلامیات کیسے پڑھائی جا رہی ہوگی۔  
اور اس.....؟ اسے وہاں موجود نہ پا کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

☆☆☆

”میں غزل سے شادی کر رہا ہوں۔“ وہ اولڈ  
ان اٹلس کی ایک گیٹ ٹو گیدر تھی..... منال، انصر، قاسم اور  
مالی یعنی مٹن شاہد تھے۔ بس یہی آسکے تھے اور لوگ نہ آسکے  
تھے۔ ان لوگوں سے باہر تھے۔ اس ملاقات کا انتظام قاسم نے کیا  
تھا اپنی سرکاری رہائش گاہ پر..... جیسی اس نے ہم پھوڑا  
تھا۔ دھماکا کیا تھا..... وہ سب چائے پی رہے تھے۔ کسی کو  
لہاں آئی، کسی کے گھونٹ بھرتے ہونٹ ساکت  
..... کوئی پرچ میں پیالی رکھتے، رکھتے منجمد  
..... اور مانی کا گھونٹ اس کا منہ جلا گیا تھا..... وہ ٹھٹھکر  
..... کا تھا۔

”کیا؟“ ان سب نے بیک وقت حرکت کی اور بیک  
..... لے گئے۔

”ہاں.....“ قاسم کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔  
”She is not your type yaar“  
..... اعتراض ہوا۔

”والٹ.....؟“ قاسم اب بھی بے پروا سا تھا۔  
”ممانہ لڑنے جا رہے ہو قاسم.....“ مانی حیران تھا۔

صرف شدید حیران نہیں بلکہ شدید ترین حیران اور حیرت اس  
کی زبان کو جکڑتی تھی۔

”کہاں..... تم سالبرل اور کہاں وہ..... کیسے ایڈجسٹ  
کرو گے؟“

”لڑکیاں ساری ایڈجسٹ ہو ہی جاتی ہیں انہیں  
کپرو مائز کرنا پڑتا ہے۔“

”غزل ایسی لڑکی نہیں.....“ منال نے شدت سے  
انکار کیا۔

”تم پچھتاؤ گے.....“ انصر بولا۔

”یوں اتنے سال بعد تمہیں کیا سوچا اس سے شادی  
کرنے کا۔“ مانی نے وجہ جانی چاہی۔

”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسی ہے.....“ قاسم نے  
وجہ بتلائی۔

”بس.....؟“

”ہاں..... بس.....“

”اور اگر وہ پسند نہ آئی تو.....؟“

”تو کیا..... شادی نہیں کروں گا.....“ قاسم کا بے پروا  
انداز اب بھی یوں ہی قائم تھا۔ اس جواب پر وہ سب ایک  
دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

”یعنی تم اسے شادی سے پہلے..... شادی کو بنیاد بنا کر  
دیکھنا چاہو گے؟“ منال نے جھپٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آف کورس.....“ وہ مسکرایا۔

”کتنے گھٹیا ہو تم قاسم.....“ منال نے اس کے منہ پر  
کہا تھا۔

”نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو..... ٹھیک ہے میں اسے  
دیکھنا چاہتا ہوں، شادی جیسا اہم فیصلہ محض دیکھنے کی چاہ میں  
نہیں کر سکتا تھا میں..... وہ پسند آگئی تو ٹھیک..... نہ آئی تو اب  
میں لحاظ کے مارے اس سے شادی کرنے سے تو  
رہا.....“ قاسم نے تردید کی۔

”بہر حال یہ کوئی اچھا فیصلہ نہیں ہے..... غزل اور  
تم..... دو الٹ لوگ ہو..... یہ حرکت غلط ہے۔“ منال کو اب  
بھی اعتراض تھا۔

”میں نے کہا ناں کہ لڑکیاں کپرو مائز کر لیتی ہیں۔ وہ  
بھی کر لے گی۔“



ہوئے اعتراف کیا تھا۔

☆☆☆

”غزل.....!“ وہ نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہی تھی جب دادا نے اسے پکارا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ان کے پاس سے اٹھ کر آئی تھی۔

”اب کون سا کام آن پڑا.....؟“ بڑبڑاتے ہوئے، وہ جائے نماز سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”غزل.....“ اسی دوران اک اور پکار آئی تھی۔

”آ رہی ہوں دادا.....“ اس نے وہیں سے پورا زور لگا کر جواب دیا۔

”دادا ابھی تک ڈرائنگ روم میں کیا کر رہے ہیں..... مہمان تو جا چکے.....“ سوچتے ہوئے اس نے پیروں میں چپل اڑی، نماز کے لیے باندھے جانے والے دوپٹے کو کھول کر شانوں پر برابر کیا۔ اس کے لمبے بال چٹیا میں بندھے ہوئے تھے لیکن کچھ ٹیس اس وقت کانوں کے پیچھے اڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت لائٹ گرین پلین کاٹن کی شرٹ اور سفید شلوار میں ملبوس تھی۔ قمیص کے ہم رنگ شیلون کا دوپٹا جس کا ایک پلو اس نے سر پر ڈالا تھا مگر وہ بار، بار پھسل، پھسل جاتا تھا۔

”جی دادا.....!“ بولتے ہوئے اس نے ڈرائنگ روم کے بھڑے ہوئے پٹوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلا تھا اور..... اور.....

اک دھماکا تو وہ تھاناں جسے سائنس بگ بینگ کہتی ہے مگر یہ جو ابھی، ابھی غزل کے عین سر پر ہوا تھا۔ یہ دھماکا بھی کسی طرح سے کسی طور سے بگ بینگ سے کم نہیں تھا کہ اس دھماکے کے نتیجے میں اس کی روح نے جیسے جسم کا ساتھ چھوڑا تھا۔

☆☆☆

اک عرصے بعد وہ آواز سنی تھی مگر ایسا لہجہ پہلی بار سماعتوں کی نذر ہوا تھا۔ وہ تو اس کا قارل لہجہ سننے کا عادی تھا۔ یوں بے فکری بھرا انداز اس لہجے کو کب سنا تھا اس نے اور وہ سن کر مسکرایا۔ یعنی کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ دادا نے اسے آواز کیوں دی تھی۔ عبدالحمید اسے پکارتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکلے تھے۔ وہ اتنے عرصے بعد اسے سامنے دیکھ کر کیسا...

”اور یہ ہی تمہاری سب سے بڑی بھول ہے قاسم.....! غزل کو کپڑا ماز کرنا ہوتا تو وہ ان چار سالوں میں بہت سی چیزوں پر کپڑا ماز کر لیتی..... وہ کتنی straight forward ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں، تم کپڑا ماز کے دھوکے میں نہ رہنا۔ مائنڈ اٹ.....“ مانی بے حد سنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا اور ماسوائے قاسم کے باقی سب کے چہروں پر تائید نظر آئی تھی۔

☆☆☆

”تمہارا کیا خیال ہے، قاسم سیریس ہے؟“ وہ منابل کو ڈراپ کرنے جا رہا تھا جی منابل نے سوال کیا تھا۔ ”کسی حد تک سیریس لگتا ہے لیکن غزل سے شادی کے فیصلے کے پیچھے جو وجہ کار فرما ہے وہ بے حد نان سیریس ہے، وہ جلد بیزار ہو جائے گا۔“ احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے مانی نے جواب دیا تھا۔

”ہاں..... یہ اس طرح کیے جانے والے فیصلے تھوڑی ہوتے ہیں۔“ منابل نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔ ”تم ملی نہیں کبھی غزل سے؟ ایک ہی شہر میں ہوتی ہو تم دونوں۔“

”ملی ہوں مگر زیادہ نہیں، یونی کے بعد بس ایک دو دفعہ..... وہ بہت مصروف آدمی ہے بھئی اور وہ آج بھی امید کے ورکرز کو نہیں بھولتی۔ میں جب بھی ملی اس نے ہر ملاقات میں یہ بات بہت خلوص سے دہرائی۔ وہ کہتی ہے کہ یہ ہمارے ہاتھوں کا بویا ہوا بیج ہے۔ اس کا اسکول واقعی بہت اچھا ہے تم جاؤ گے ملنے؟“

”ہاں..... کیوں نہیں..... میں تو اسے اسلامیات ڈیپارٹمنٹ میں بھی ڈھونڈنے گیا تھا۔ بڑے خواب تھے اس کے یونی کے پروفیسر بننے کے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ منابل بھی ہنس دی۔

”وہ اس سے بھی بڑا کام کر رہی ہے مانی..... یونی اس کے اسکول میں محض غربا کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ امیروں کے لیے چند مخصوص نشستیں ہیں بس اور ہر کوئی مرا جاتا ہے۔ ان نشستوں پہ اپنے بچوں کو داخلہ دلوانے کو.....“ منابل کے لہجے میں ستائش تھی۔

”یہ غزل مراد ہی کر سکتی تھی۔“ مانی نے متاثر ہوتے



”اگر ظاہر ہے کی؟ کیا وہ خوش ہوگی؟ اسے فطری تجسس  
 اس نے نظریں دروازے پر مرکوز کر دیں۔ چند لمحوں بعد  
 اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور عثمان شاہد نے تصور کیا  
 سیاہ عبایا..... سیاہ لباس، فوکل گلاسز، دستانوں اور جرابوں  
 میں مقید ہاتھ اور پیر..... یہ غزل مراد تھی اس کے لیے  
 اور پھر.....

”جی دادا.....“ اب کہ آواز بے حد قریب سے آئی تھی  
 اور..... عثمان شاہد کو دل اپنی جگہ سے ہلتا ہوا محسوس  
 ہوا تھا یہ کسی بھی طرح سے اس کے لیے بھی ایک بگ بینگ  
 نے لم نہیں تھا۔ اس کا دل اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ وہ یک دم  
 اپنے سے کھڑا ہوا تھا۔ بے اختیاری حرکت، لاشعوری طور  
 پر مرضی کے بنا ہی..... حسن اس کے سامنے تھا اور حسن  
 بھی وہ کہ اس جیسا دو جا کوئی نہیں..... کہیں نہیں..... وہ وسیع  
 آسمان پر چمکنے والا اکیلا چاند تھا، وہ حسن کہ جس نے عثمان  
 شاہد کو حیران نہیں پریشان بلکہ مبہوت کر دیا تھا۔ ایک پل کو وہ  
 دونوں ہی ٹھٹھ کر رہ گئے تھے اور پھر غزل نے بے ساختہ منہ  
 پر ہاتھ رکھا اور بے اختیار تیزی سے پیچھے کو پلٹی تھی اور  
 مانی..... وہ ابھی تک ابھی تک بے یقین ہو کر دروازے کو تکتا  
 رہا تھا۔ یہ، یہ کیا تھا۔ کیا تھا آخر..... کیا ان آنکھوں نے کوئی  
 خواب دیکھا؟ نہیں تو..... ان آنکھوں نے تو بس ایک پری  
 پیکر دیکھا اور وہ آنکھیں یوں دیکھے جانے پر بے یقین  
 تھیں..... تحیر سے پرتھیں اور یقین کرنے کے واسطے ایک بار  
 پھر سے دیکھنا چاہتی تھیں اور بار، بار سوال اٹھاتی تھیں..... وہ  
 کیا تھا..... کیا تھا وہ.....؟ جارے جھلے..... وہ حسن با کمال تھا  
 اور کیا تھا۔

☆☆☆

کتنی ہی دیر وہ عجب سن کر کے رکھ دینے والے  
 احساس کا شکار رہی تھی۔ ہاتھ گود میں رکھے، بے جان جسم  
 کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور یقین کرنے میں متامل تھی کہ اس  
 کا عثمان شاہد سے یوں سامنا ہوا تھا۔ یوں.....؟ عبدالحمید  
 اسے آوازیں دیتے ہوئے باہر نکلے اور ساتھ ہی کچن کی  
 طرف چلے گئے تاکہ وہ مہمان کی خاطر مدارات کا کہہ سکیں۔  
 ان کے گمان میں نہیں تھا کہ غزل کو مہمان کی آمد کا علم نہیں  
 ہوگا اور غزل..... عثمان کے آنے سے قبل چند لوگ اسکول

کے کسی تعمیراتی کام کے سلسلے میں ملنے آئے تھے۔ چائے کا  
 دور چل رہا تھا جب وہ نماز کا کہہ کر وہاں سے آئی تھی۔ اس  
 کے بعد ان لوگوں کو چلے جانا تھا۔ وہاں کمرے میں آکر اس  
 نے عبایا اتار دیا تھا کہ اب اس کا دوبارہ وہاں اندر جانے کا  
 ارادہ نہیں تھا..... وہ جیسے ہی وضو کر کے آئی تو آوازوں سے  
 محسوس ہوا کہ مہمان جارہے ہیں۔ مانی کب آیا.....؟ اسے  
 معلوم نہیں تھا، وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئی تھی اور  
 اس..... اس کے بعد سارے واقعے کو سوچتے ہوئے ایک  
 بار پھر سے اس کے پورے بدن میں جھنجھٹ سی اٹھی تھی۔  
 اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں بے بسی سے گرایا تھا۔ کس  
 نے سوچا تھا کہ ایسا کبھی ہوگا..... یوں بھی لکھا تھا..... یہ بھی  
 طے تھا کہ ایک دن اس کا عثمان شاہد سے یوں سامنا  
 ہوگا..... یوں؟ اماں اور دادا سمجھا، سمجھا کر تھک گئے کہ وہ  
 محض اتفاق تھا اور بس..... مگر اس کی چپ نہ ٹوٹی تھی۔  
 آنکھیں جلتی تھیں مگر بہتی نہیں تھیں..... عجب تکلیف وہ  
 حالت تھی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”غزل.....“ اماں نے پیار سے پکارا۔

”پلیز اماں مجھے اکیلا چھوڑ دیں پلیز.....“ ہاتھوں  
 پر سر اٹھا کر اس نے اس لہجے میں کہا جسے اماں سننے کی عادی  
 نہیں تھیں، وہ یک دم چپ ہو گئیں اور پھر اس کا سر تھپتھا کر  
 باہر نکل آئیں اور وہ..... وہ کیا بتاتی اماں کو..... کیا.....؟  
 کہ اس کے دل نے ایسا ہی چاہا تھا۔ ہاں اس نے چاہا تھا  
 کہ وہ عثمان شاہد پر کبھی عیاں ہو جائے..... اسے مائل  
 کر لے اپنے حسن سے..... اور یہ خواہش کسی گناہ کی طرح  
 اس کے دل میں پلتی تھی..... اور آج..... آج..... کیا  
 ہوا.....؟ وہ اٹھی اور بے دم ہوتے قدموں کے ساتھ  
 کمرے کی کھڑکی تک آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے  
 کھڑکی کے پٹوں کو داکیا اور چند لمحے وہ سر جھکائے کھڑکی  
 رہی..... یوں جیسے ہمت نہ ہو اس طرف دیکھنے کی اس نے  
 حلق سے کچھ ابھر، ابھر کر ڈوبتا رہا اور پھر اس نے آہستہ  
 سے نظریں آسمان کی طرف اٹھائی تھیں۔ وہ آسمان کو دیکھتی  
 رہی..... عجب نظروں سے..... وہ..... وہ اللہ تھا  
 ناں..... اور اس کی وہ ہی جانے..... اس کے اپنے انداز،  
 اپنے فیصلے اور اپنے کام اس نے ایک بار پھر سے ایک لمحہ



## عنان گیر

معدوم ہو جاتا، برقی آلے نے اسے کچ کیا تھا اور منابل کے کانوں تک پہنچا دیا تھا۔

”کیا.....؟“ اور منابل نے اس زور سے کیا کہا تھا کہ اندر کمرے میں سویا ہوا اس کا شوہر بڑا کراٹھ بیٹھا تھا۔ ”تم نے کہاں دیکھ لیا اسے؟“ اور اب وہ اسی طرح بلند آواز میں، بے حد جوش کے ساتھ مانی سے پوچھ رہی تھی۔

☆☆☆

محبت کو ”ہونہہ“ کہا جاسکتا ہوتا اور ”ہونہہ“ کہہ کر گردن موڑی جاسکتی ہوتی تو غزل مراد سب سے پہلے ایسا کرتی..... محبت کو ٹھڈا مار کر پرے گرایا جاسکتا ہوتا تو غزل مراد ٹھڈے مار، مار کر محبت کو گہری، اندھی کھائیوں میں لے جا کر پھینکتی، محبت کو غرق کیا جاسکتا ہوتا تو غزل مراد اسے بحرِ احمر میں جا ڈبوئی..... اس کا کوئی تریاق ہوتا تو وہ بھی سب سے پہلے غزل مراد ہی ایجاد کرتی۔ تو یقیناً محبت کو ”ہونہہ“ نہیں کہا جاسکتا..... ٹھڈے مارنے پر بھی یہ کہیں نہیں جاتی بلکہ اور ڈھیٹ بن کر اکڑ جاتی ہے۔ دریا برد کر دینے کا شوق بھی آپ خود کی جان سے پورا کر سکتے ہیں، محبت سے نہیں۔ اور رہ گیا تریاق تو جائیں صاحب..... محبت کو جھیلے، احمقانہ بات مت کیجیے..... اس کا کوئی تریاق نہیں..... کوئی علاج بھی نہیں..... گر ہوتا تو غزل مراد کو کسی سے بھی اس جہان کے کسی بھی دوسرے مرد سے محبت ہو جاتی..... عثمان شاہد سے نہیں..... محبت کو ہوتا ہوتا ہے اور یہ ہو جاتی ہے۔ بنا حسب نسب دیکھے، بنا جانچے، بنا پرکھے، یہ بس ہو جاتی ہے۔ اسے بھی ہو گئی تھی۔ کب، کیسے، کیوں جیسے سوال فضول تھے، بکو اس سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ اسے ٹینا بری لگتی تھی، اسے زارا سے چڑھتی، اسے منابل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ سلمیٰ اور راحیلہ بھی نہیں کہ جب وہ یوں ہنستے، مسکراتے، بے تکلفی سے مانی سے بات کیا کرتی تھیں۔ اور تب تب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نقاب گرا دے..... اور ہاتھ، پیر کھول دے اور تن کر اس کے سامنے کھڑی ہو جائے اور کھڑی ہو کر اس سے پوچھے..... بھلا بتاؤ تو سہی عثمان شاہد..... کیا میں دیکھے جانے کے لائق نہیں؟ کیا میرے سوا اب بھی کہیں اور تم دیکھنا چاہو گے؟ بھلا بتاؤ تو سہی عثمان شاہد..... مانی کبھی اسے reachable نہیں لگا..... اس نے ہمیشہ یہ ہی سوچا تھا یہی سمجھا تھا کہ مانی کی ترجیحات میں بھی غزل جیسی لڑکی شامل

کے۔ ل کو اک مرد کی محبت سے آزمایا تھا اور یہ محبت..... اس کی کہانی تو ازل سے چلتی آرہی ہے ہانبل اور قاتیل سے لے کر..... بی بی ہاجرہ کے ناک، کان چھدوانے تک۔ جناب یوسف کے الزام سے لے کر..... رہتی دنیا تک..... اسے چلتے ہی رہنا..... کبھی آزمائش بن کر اور کبھی انعام بن کر..... اسے چلتے ہی رہنا ہے۔

☆☆☆

”منابل.....“ رات کے اس پہر فون کے دوسری طرف ابھرنے والی آواز کی سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی اور سرگوشی بھی ایسی جو اندھیری کالی رات میں کسی اسرار کا پتا دیتی ہو جیسے کسی اسرار کا بھید کھولنے والی ہو.....

”مانی.....؟“ منابل نے حیران ہو کر فون کان سے ہٹایا..... اور اسکرین کو دیکھا اور جب وہ اسکرین کو دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں کو دھندلا سا نظر آتا تھا کہ وہ نیند میں تھی۔ اس نے اک نظر سوئے ہوئے شوہر پر ڈالی اور اٹھ کر باہر نکل آئی تھی کہ اس کا شوہر اس وقت مانی کی کال پر ڈسٹرب نہ ہوتا، ہاں البتہ منابل کی آواز سے ضرور ہو جاتا۔

”کیا بات ہے؟ اس وقت کال کی، خیریت؟“ وہ پریشانی سے پوچھتی تھی۔

”وہ..... وہ بہت خوب صورت ہے منابل، بے حد خوب صورت.....“ عجب بے قرار سا لہجہ تھا۔

”کون..... کس کی بات کر رہے ہو تم؟ پاگل تو نہیں ہو گئے؟“ پریشانی، حیرانی میں بدلی تھی اور دوسری طرف مانی..... وہ سنتا کب تھا وہ تو بس اپنی کہتا تھا۔

”وہ ٹھیک کرتی تھی جو یوں خود کو چھپا کر رکھتی تھی۔ وہ سی طرح چھپائے جانے کے لائق تھی۔ وہ عیاں کرنے کے لائق نہیں تھی۔ عورت اتنی پاکیزہ بھی ہو سکتی ہے منابل؟“ اور منابل جھنجھلا اٹھی۔

”مانی کیا ہو گیا ہے، کس کی بات کر رہے ہو تم؟“ اور اس وقت منابل مرکز بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ غزل کی بات کر رہا تھا۔ مانی نے اک لمبی سانس اندر کھینچی یوں جیسے کسی خوشبو کو اٹھراتا رہا ہو اور پھر بے دم ہو کر بیڈ پر پشت کے بل گرا تھا۔

”غزل..... غزل مراد.....“ اس کے لبوں سے... ہراتا سا نام آزاد ہوا۔ اور قبل اس کے وہ فضا میں گم ہو کر



نہیں ہوگی۔ وہ اور مزاج کا تھا اور غزل نے ہمیشہ خود کو اس کے لیے مس فٹ سمجھا..... اس نے تو کبھی عثمان شاہد کو دعا میں بھی نہیں مانگا..... مانگتی تو تب ناں کہ جب وہ خود کو عثمان کے قابل سمجھتی..... اس نے بس طے کر رکھا تھا کہ وہ اس کے لیے نہیں تھا۔ کبھی ہو بھی نہیں سکتا تھا تو تب ہاں تب اس کے دل میں عجب خواہش نے جنم لیا، اگر وہ عثمان کے سامنے آجائے تو کیا تماشا ہو؟ حسن بہت بڑی آفت ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں تو کیا ہو، گروہ اک بار..... اک بار کسی طرح سے عثمان شاہد پر آشکار ہو جائے..... اک بار محض اک بار ”نہیں.....“ اس نے خود کو روک رکھا..... اس گناہ جیسی خواہش کے ہاتھوں بے بس ہونے کے باوجود خود کو لاچار ہونے نہ دیا۔ اس نے اپنے قدموں کو سالم رکھا اور کبھی عثمان کو کیا، کسی دوسرے تیسرے کو بھی یہ بھٹک بھی پڑنے دی تھی کہ وہ مانی کو پسند کرتی ہے۔ وہ جلتی رہی، سلگتی رہی، چنچتی رہی، مرتی رہی لیکن خود کو خاک بننے نہ دیا، مرنے نہ دیا..... اس حال تک جانے نہ دیا کہ جہاں وہ خود کو خود ہی نہ دیکھنا چاہیے..... تو اس نے بند باندھے رکھے گو کہ اس کے بازو اس کے تحمل نہ تھے۔ ہر نیا آنے والا دن اسے کمزور کرتا..... ہر نئے چڑھنے والے دن میں وہ خود کو مضبوط کرتی..... ہر روز اس کے قدم بھکنے لگتے، ہر روز وہ سیدھی ہموار چال چلنے میں بے حال ہوتی..... ہر اک یوم میں محبت نے اس کے چہرے پر چابک مارے تھے۔ ہر اک یوم میں اس نے اپنے زخموں کو پاٹا تھا کہ مرہم نہیں ہوتا ایسے زخموں کا..... جو محبت بڑی محبت سے لگاتی ہے۔ تو یہ ہوا اور بے حد شدت سے ہوا ہر روز ہوا اور جب، جب ہوا غزل مراد کو بے مراد کر کے رکھ گیا لیکن وہ..... وہ محبت سے بڑی بلا تھی پاک دامن وہ نہیں ہوتا جسے گناہ کرنے کا موقع نہ ملے..... پاکیزہ تو وہ ہوتا ہے جو موقع ملنے پر بھی اپنے دامن کی سفیدی کو داغ دار نہ ہونے دے..... چاہے اس کے لیے اسے سر کے بل ساری عمر ہی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے۔ وہ عورت تھی..... انسان تھی اور محبت اک فطری جذبہ، وہ اسی جذبے کے ساتھ پیدا کی گئی تھی جیسے بہت سارے اور سارے انسان..... جیسے کہ بہت سارے مرد..... تو وہ اک فطری جذبہ کا شکار ہوئی تھی لیکن اس نے حدیں نہ پھلائیں، وہ ان کے قریب تک نہیں پھٹکی تھی۔ اس نے صبر کیا اور رہ گئی وہاں..... تو یہ اسی طرح سے بے اختیار ہے جس طرح کہ

محبت..... گمان، خیال اور سوچ پر بند نہیں باندھے جاتے۔ سوچیں..... خواہشیں، بے اختیار، لاشعوری طور پر ذہن میں آجایا کرتی ہیں اور ہر سوچ، پُر خیال، ہر گمان اور ہر خواہش ٹھیک نہیں ہوتی..... بعض گمان گناہ بھی ہوتے ہیں تو غزل مراد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا گمان، خواہش تھی مگر آفرین کہ خواہش کے گھوڑے کو اس نے بے دلی کی لگا میں نہیں باندھی تھیں۔ اس نے خواہش کے بدن پر ضبط کے چابک برسائے تھے۔ صبر کی ضرب لگائی تھی اور اب جبکہ خواہش زور نہ مارتی تو یہ..... یہ ہو گیا تھا وہ عثمان شاہد پر عیاں ہو گئی تھی..... کیوں؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حل کرنے پر بھی وہ معما حل نہیں ہوا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ وہ اتنے سال بعد کیوں آیا تھا اس کے شہر میں.....؟ اب کیوں.....؟

☆☆☆

”غزل سے شادی کی صورت تمہیں اسی شہر میں سیٹل ہونا پڑے گا..... ہو سکتے ہو؟“

”جی..... میری جاب اسی شہر میں ہے اور مجھے یہاں سیٹل ہونے میں کوئی مسئلہ نہیں۔“

”کل کو کہیں اور پوسٹنگ ہوئی تو؟“

”تو میرے ریسورسز اتنے ہیں کہ اپنی پوسٹنگ رکوا سکتا ہوں.....“

”تمہاری فیملی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ یہ نہ ہو کہ کل کو وہ کہیں کہ ہم نے ان کا لڑکا ہتھیالیا ہے۔“

”نہیں ہوگا سر.....! دو بڑے بھائی ہیں وہ میرے ہیں..... ایک ہمارے آبائی شہر میں ہیں اور ایک کی مری میں رہائش ہے..... باقی رہ گئے امی اور ابو تو انہیں میں اپنے ساتھ ہی لے آؤں گا۔ اور میری امی اپنی دونوں بہوؤں سے اس قدر نالاں ہیں کہ وہ میرے ساتھ آنے میں ذرا سی تاخیر بھی گوارا نہیں کریں گی..... اور جب امی، راضی تو ابو کی کیا مجال کہ وہ انکار کر سکیں۔“ اب کہ تفصیل سے جواب آیا تھا.....

عبد الحمید نے مسکراہٹ روکی تھی۔

”اور اگر کل کلاں تمہاری امی تیسری بہو سے بھی بیزار ہو گئیں تو.....؟ ایسی کوئی اچھی گھر گزشتہ نہیں ہے میری پوتی..... اسے بس سوشل ورک کرنا آتا ہے۔“

”کیا کر سکتی ہیں تب وہ، چوتھے بیٹے کا آپشن نہیں ہے ان کے پاس..... اور ان کی ناک انہیں بڑی بہوؤں کے



## عنان گیر

پھر بھی باز نہیں آیا تھا۔ غزل زرج ہوئی۔ ناراضی سے اسے دیکھا اور اسے یہ یقین دلانے کے واسطے وہ نہ صرف غصہ ہو سکتی ہے بلکہ ناراض بھی ہو سکتی ہے۔ وہ واک آؤٹ کر گئی تھی اور جیسے ہی بالکونی کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی اسے ایک قہقہہ سنائی دیا تھا۔ اچھا وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ واقعی تنگ ہوئے جا رہی تھی۔

”ایڈیٹ.....“ وہ زرب لب مسکرائی۔

بالکونی میں ملگیا سا اندھیرا تھا۔ گھروں کی بیرونی آن لائٹس یہ بتانے کو کافی تھیں کہ مکین سو رہے تھے۔ ہوا بڑی مدم سی، نرمی سے مورنی کی سی چال سے چلتی اس کے وجود سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنی پشت پر کمرے میں کھڑ پڑکی آوازیں سن سکتی تھی۔ اپنے سامنے موجود مکانات کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے لیکچرار، تعینات ہونے کے بعد میں نے پہلا کام کیا کیا تھا؟“ وہ گرل سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا تھا۔

”کیا، کیا تھا؟“ ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد غزل نے گرل پر انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”میں اسلامیات ڈیپارٹمنٹ تمہیں دیکھنے گیا تھا.....“ چند لمحوں بعد جواب آیا اور وہ چونکی۔

”کیوں.....؟“

”یہ دیکھنے کے لیے کہ اب اسلامیات کیسے پڑھائی جاتی ہے.....“ اور وہ ہنس دی۔

”تو دیکھ لیا.....؟“ چھیڑتے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔

”تم نے کیوں آگے تعلیم نہ حاصل کی غزل؟ بڑے خواب تھے تمہارے۔“

غزل مدہم سا مسکرائی۔ اور اس کی انگلی گرل پر نا دیدہ سی لکیریں کھینچی چلی گئی۔

”میری زندگی میں بے سکونی ہو گئی تھی..... مجھے سکون بس اسکول میں ملتا تھا۔ دیوار مہربانی پر کپڑے ٹانگنے میں ملتا تھا تو بس میں نے خود کو اسکول میں، فلاحی کلاسوں میں ضم کر دیا کہ چارہ اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، انگلی کی حرکت رکی اور وہ مسکرائی۔

”اسی لیے تمہارے گریڈز بھی لو ہو گئے تھے؟“ مانی

پاس جانے نہ دے گی۔“ وہ مزہ لیتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ تم پھنسا کے رہے ہو؟“ عبد الحمید مشکوک ہوئے۔

”آپ کو.....“ اس نے آنکھ مار کر جواب دیا تھا اور ڈرائنگ روم مردانہ قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ عبد الحمید اس کے والدین سے مل لیے تھے اور کچھ بھی فائل کرنے سے قبل سارے معاملات کلیئر کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ ایک دوسرے فریق سے بھی کم و بیش ایسا ہی مکالمہ کر چکے تھے۔ دیکھیے کہ قرعہ قال کس کے نام نکلتا ہے..... عثمان شاہد، مانی یا قاسم محمد.....

☆☆☆

”کیا تم واقعی ہی میں وہ ہو جو کہ عبا یا میں ملبوس ہوا کرتی تھیں۔“ یہ سوال اس سے اتنی بار پوچھا جا چکا تھا کہ اب اسے خندہ پیشانی سے برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس نے ایک برہم نظر اس پر ڈالی تھی۔

”میرے خدایا.....!“ بے ساختہ اس نے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

”تم یوں بھی دیکھ سکتی ہو کیا؟“ شادی سے لے کر اب تک وہ حیران ہی تو ہو رہا تھا۔ اب ایک بار پھر ہوا اور اس کے حیران ہونے پر غزل نے ایک اور پہلے سے زیادہ برہم اور تیز نظر اس پر ڈالی تھی۔ ”غزل..... تم مجھ پر غصہ ہو رہی ہو کیا؟“ اور وہ گدھا..... اور شدت سے حیران ہوا یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ ہی حیرانی تو غزل مراد کو چڑا رہی تھی۔

”میں ایک نارمل انسان ہوں..... اور غصہ آنے والی بات پر غصہ ہی کر سکتی ہوں ناں.....“ نظروں کے برعکس اب کہ شدید برہم لہجے میں جواب آیا تھا۔ اور وہ ہنس دیا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں اور تم..... پارکب کسی نے سوچا تھا ایسا.....“ اور غزل اس بات پہ مل کھا کر رہ گئی تھی۔

”تو آپ جناب کو یقین دلوانے کے لیے میں کیا کروں.....؟ سوچ میں انگلی دے دوں.....؟ زور سے چنگی کاٹوں؟ یا پھر ہاتھوں کا استعمال کروں؟“ وہ واقعی میں دوبارہ آستین چڑھاتے ہوئے تنک کر بولی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ اور اب کہ حیرت نے اسے دہرا کر کے رکھ دیا تھا۔

”یہ تم ہو..... کیا واقعی ہی میں تم..... وہ ہی غزل مراد ہو..... ریکی..... وہ یونی والی.....؟“ حیران ہونے سے وہ



۱۱۔ ہاتھ کرل کے اوپر رکھتے ہوئے حیرت سے بولا تھا۔  
کرل کی انگلیوں کے درمیان مل پڑا اور.....

”آف..... مانی..... ایک تو.....“ اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے حیرانی سے درحقیقت شاک سے مانی کے ہاتھ میں موجود اس کیپ کو دیکھا تھا۔ ”تو یہ تمہارے پاس اب بھی موجود ہے مانی؟“ اس نے عثمان کے ہاتھ سے کیپ لی اور مڑ کر دروازے کے قریب جا کر کمرے میں جلتی لائٹ کی روشنی میں اسے دیکھا..... مانی نے مسکراتے ہوئے اس کے شاکڈ چہرے کو دیکھا۔ وہ اب ”thank you“ کے الفاظ پر انگلی پھیر رہی تھی اور اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات تھے۔

”تم جانتے ہو میں نے یہ تھینک یو کیوں لکھا تھا؟“ اس نے اچانک چہرہ اس کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔  
”اسکول کے لیے کی گئی مدد..... کے لیے۔“ اور وہ زور کا قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی بتاتی تھی کہ جواب غلط تھا۔ مانی نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”تو پھر کیوں لکھا؟“ وہ پوچھتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ غزل نے ہونٹ کا کوندانتوں میں دبایا اور شرارت سے پر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا۔

”کیا اسے بتا دوں؟“ دل دھک، دھک کر کے پوچھتا تھا۔

”کیوں لکھا تھا؟“ اس کے کندھے کو ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا گیا۔ اس نے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ کو قابو کیا..... سر جھکائے ایک بار پھر وہ اپنے لکھے گئے الفاظ پر انگلی پھیر رہی تھی۔

”you made me feel like a woman“ اور پھر بے حد آہستگی سے اس نے کہا تھا۔

”واٹ.....؟“ مانی یوں بولا جیسے اس کا پورے کا پورا ہاتھ سوچ میں دے دیا گیا ہو۔

”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“ وہ سب سے زیادہ حیران اب دکھتا تھا۔

”بیڑا غرق.....“ غزل کوفت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔ وہ ہر دفعہ ہی کیوں اتنا حیران ہو جایا کرتا تھا۔

”تم کہنا چاہتی ہو، میں نے تمہیں اٹریکٹ کیا؟“

پہلے وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔ پھر اس نے دونوں بازو پھیلا کر کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ پایا اور اب..... اب منوں، منوں حیرت سے پوچھتا تھا۔

”I can,t believe this... can,t“  
believe this میں نے..... میں نے تمہیں اٹریکٹ کیا غزل.....؟“ وہ سب سے زیادہ والی حیرت کے ساتھ پوچھتا تھا اور غزل نے بے اختیار اپنا ہاتھ مارنے والے انداز میں دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا تھا۔

”یہ آدمی.....“ اس نے ایک تیز برہم نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔ معلوم نہیں اعتراف سن کر اس شخص کی حالت کیا ہوگی؟ بے ساختہ اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

اس نے مانی سے کہا تھا اسے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ جب وہ دونوں ہاتھ شاپنگ بیگ سے بھرے، لدی پھندی اور مانی کی جیب کا بیڑا غرق کر کے گاڑی میں بیٹھی تو اس نے مانی کو دیوار مہربانی کی طرف چلنے کو کہا تھا۔

”تو یہ ساری شاپنگ اس لیے تھی؟“ مانی نے پوچھا اور اس نے جواب نہ دیا تھا۔ وہ بس سر جھکائے بیگز کو چیک کر رہی تھی۔ جون کی گری عروج پر تھی۔ چلیلاتی دھوپ نے ہر طرف ایک غبار سا قائم کر رکھا تھا اور وہ اس دیوار کو بھر دینا چاہتی تھی۔ عید سے پہلے، پہلے..... گاڑی دیوار کے پاس جا کر رکی..... گاڑی کے خنک ماحول سے نکلتے ہی لوکا اک بھر پور تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ اور وہ ساکت ہوئی..... اس تھپڑ سے نہیں اس دیوار کو دیکھ کر اور یک دم اس پر انکشاف ہوا کہ محبت یہیں سے تو شروع ہوئی تھی۔ وہ مانی کی اسی عادت سے تو متاثر ہوئی تھی..... جیسے آج اس نے اتنے روپوں کی خریداری پہ کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اور ان روپوں کو دیوار پر ٹانگنے پر بھی کوئی ایک سوالیہ نشان نہیں اٹھایا تھا۔ ایسے ہی وہ تب، تب بھی کیا کرتا تھا، وہ پیدائشی سوشل ورکر تھا..... اس کے پاس وہ دل تھا جو کہ کسی بھی تخلص سوشل ورکر کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے حیرت سے شاک سے مڑ کر گاڑی سے شاپنگ بیگز باہر نکالتے ہوئے مانی کو دیکھا۔

”مجھے اس شخص کے سوا اور کون سپورٹ کر سکتا تھا۔“  
”کون؟“ اور اس کے ساتھ ہی غزل نے آنکھوں میں کسی پڑ



## عنان گیر

یہ ”کیا“ تو بڑی دیر بعد اس کے منہ سے ادا ہو رہا تھا..... وہ دو قدم آگے کو آیا۔ انکشاف ایسا زبردست کہ مانی کو ٹریفک کا شور، لوگوں کا ہجوم، گرمی، ٹھیلے والوں کی آوازیں سب کچھ پس منظر میں جاتا ہوا محسوس ہوا..... وہاں وہ تھا اور اس کے سامنے کھڑی، سیاہ عبایا میں ملبوس وہ عورت.....

”تو کیا تم ساری عمر مجھے حیران کرتی رہو گی غزل مراد.....؟“ اس کا لہجہ آنچ دیتا تھا۔ غزل جھکے سر کے ساتھ مسکرائی۔ اس نے شاپنگ بیگز کا وزن ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور نظر نے اک بار پھر سے اس کی شرٹ کے بٹن گنے تھے۔ اب کہ ذرا قریب سے.....

”ہاں.....“ اس نے کہا اور مڑ گئی..... اور مڑ کر دیوار کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ اپنی پشت پر پیش محسوس کر سکتی تھی۔ اور وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ یہ پیش سورج کی نہ تھی دو آنکھوں کی تھی۔

”تم کیا ہو غزل مراد.....؟“ مانی نے ساؤٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”as usual..... سمجھ سے باہر۔“ اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا اور دیوار کی قریب جا کر شاپنگ بیگز زمین پر رکھ دیے..... وہ اب ان میں سے نئے کپڑے نکال کر وہاں ٹانگ رہی تھی۔ اور جنہی اس کے دائیں کندھے کے برابر اک اور وجود آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بھی شاپنگ بیگز کو زمین پر رکھا اور ان میں سے کپڑے نکال کر دیوار پر ٹانگنے شروع کر دیے۔ غزل نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا..... عین اسی لمحے اس نے بھی ہاتھ روک کر اسے دیکھا تھا اور نظر نے اب کہ جرأت کر ہی لی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا..... مسکرائی اور ہاتھ ایک بار پھر سے دیوار کو آراستہ کرنے لگے تھے۔ وہ خوش قسمت عورت تھی..... وہ پاک دامن تھی کہ اس نے دل کو اپنا عنان گیر بننے نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنی سب لگا میں، سب ڈوریں، اس ایک کے سپرد کردی تھیں جو سب سے زیادہ حق رکھتا ہے کہ وجود اس کے حوالے کیے جائیں وہ ہی جو کہ حقیقی ”عنان گیر“ ہے۔ وہ کہ جو ”رب“ ہے..... اور وہ ہی کہ جو ہماری زندگیوں کی تمام ڈوریں ہلاتا ہے۔

کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی طرف مڑی تھی۔ اس نے جھک کر گاڑی میں پڑے چند شاپنگ بیگز اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔

”تمہیں معلوم ہے عثمان شاہد..... میں اسلامیات کیوں نہیں پڑھا سکی۔“ مصروف سے انداز میں شاپنگ بیگز اٹھاتے ہوئے سوال کیا گیا مانی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ کون سا موقع تھا..... یہ سوال پوچھنے کا؟ یا پھر اس بات کی وجہ بتانے کا؟

”کیوں نہ پڑھا پائیں؟“ وہ اس کی برہم نظر کا شکار اک بار پھر سے... نہیں ہونا چاہتا تھا سو حیرت دبا کر پوچھا..... غزل سیدھی ہوئی..... اک نظر آسمان پر ڈالی، سورج بڑی ہی تیز، تیز شعاعیں پھینک رہا تھا..... ہوا بھی گرم، گرم سی چل رہی تھی۔ اور پھر اس نے دوسری نظر اطراف میں ڈالی..... گاڑیوں کے پاں، پاں کا شور، گرمی سے بے حال ہوتے لوگوں کا ہجوم، ٹریفک کا سیاہ دھواں..... لوگوں کا شور..... ٹھیلے والوں کی آوازیں..... بھیک مانگتے ہوئے فقیر اور..... اور بے ساختہ اس نے اک ٹھنڈی سی سانس بھری..... یہ کوئی آئیڈیل پھویشن تو نہیں تھی..... اعتراف کے لیے مگر کیا، کیا جائے کہ زندگی آئیڈیل پھویشن پیش نہیں کرتی اور کہانی کو وہیں پر ختم ہونا تھا کہ جہاں سے شروع ہوئی۔

”بول بھی دو اب.....“ مانی نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

”مجھے، مجھے.....“ اس نے مانی کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا اور نظر اس کی شرٹ کے بٹن کنتی تھی اور اس سے اوپر تلک جانے پر راضی نہیں ہوئی۔

”مجھے محبت ہو گئی تھی.....“ اب کہ اس نے مانی کی فولڈ اسٹیو کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”تم سے.....“ اور جملے کا اگلا حصہ بے حد سرسرا تا ہوا اس کے منہ سے نکلا اور نظر نے بالآخر کالریک کا فاصلہ طے کر ہی لیا تھا۔

”کیا؟“ پہلے اس کا منہ کھلا اور اب..... اب کہ صحیح معنوں میں وہ سب سے زیادہ والی حیرت سے اپنے سامنے کھڑی عورت کو تنکٹا تھا۔